www.taemeernews.com
حضرت بابا فرید گنج شکرؒ
شخصیت اور فن
مرتبہ
کشمیری لال ذاکر

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ

فن اور شخصیت

مرتبہ

کشمیری لال ذاکر

ہریانہ اردو اکادمی،
آئی پی 16، اکادمی بھون، سیکٹر 14، پنچکولہ (ہریانہ)

نام کتاب	:	حضرت بابا فرید گنج شکرؒ۔ فن اور شخصیت
مرتبہ	:	کشمیری لال ذاکر
بہ اہتمام	:	شمس تبریزی
معاون	:	ڈاکٹر محمد ایوب خاں
تعداد	:	پانچ سو
سن اشاعت	:	2010
قیمت	:	100 روپے

کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے گوئل نٹ پرائزز، شاہدرہ نئی دہلی سے چھپوا کر دفتر ہریانہ اردو اکادمی، اکادمی بھون، سیکٹر 14 پنچکولہ سے جاری کیا۔

فہرست

پیش لفظ

ہندوستان مختلف مذاہب اور گنگا جمنی تہذیب کا گہوارا ہے۔ یہاں ہزاروں سنتوں، صوفیوں اور درویشوں نے اپنے پیغامات کوچے کوچے میں لوگوں تک پہنچائے نیز ایک مشترکہ تہذیبی، ثقافتی اخلاقی شعری اور روحانی سرمایہ ان صوفی سنتوں نے ہندوستانیوں کو دیا۔ جس کا فیضانِ فیض آج بھی ہماری نسلوں کو برابر حاصل ہو رہا ہے۔ آج بھی ہماری اخلاقی و روحانی قدریں ہندوستانی صوفیائے کرام کے پیغام اور تعلیمات سے وابستہ ہیں۔ چاہے حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہوں، بوعلی شاہ قلندر ہوں، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہوں، امیر خسرو ہوں یا بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ہوں، ان کی تعلیمات و پیغامات آج بھی لوگوں کی رہنمائی کے لیے درس کا درجہ رکھتے ہیں۔

امیر خسرو اور بابا فرید دونوں صوفی اردو اور ہندی اور پنجابی زبان میں یکساں اہمیت اور عظمت کے حامل ہیں۔ بابا فرید کا مرتبہ و مقام صرف ایک روحانی بزرگ کے طور پر ہی نہیں بلکہ صوفی شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت نمایاں ہے۔ بابا فرید گنج شکر جو سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنی تعلیمات و پیغامات اور تصوف کے رموز و نکات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے اور ان کی نشر و اشاعت کے لیے جس زبان کا سہارا لیا وہ زبان اُس وقت ہندوی یا ہندوستانی کہلاتی تھی جسے آج اردو والے اردو مانتے ہیں اور ہندی والے بابا فرید کو ہندی زبان کا شاعر مانتے ہیں، نیز اپنی تعلیمات و پیغامات کی ترسیل و ابلاغ کے لیے انہوں نے شاعری کو ذریعۂ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ حالانکہ وہ ایک اچھے فارسی داں تھے لیکن انہوں نے خالص ہندوستانی زبان میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے۔ حقیقت کی رو سے اگر دیکھا جائے تو انہوں نے شاعری اپنے ذوق و شوق کے لیے کی نہ کہ شہرت حاصل کرنے کے لیے بلکہ ان کے شاگردان کے کلام کو تحریری شکل دیتے رہے جب وہ شاعری کے ذریعہ تبلیغ کے کام کو انجام دیتے تھے۔

جیسا کہ وہ ایک صوفی شاعر ہیں اور ہندی اور اُردو ادب دونوں میں صوفی

وچار دھارایا صوفی تحریک ایک اپنی شناخت رکھتی ہے، چنانچہ ان کی شاعری میں وہ تمام عناصر تحلیل ہو گئے جن کا تعلق اور جن کی جڑیں تصوّف اور روحانیت سے وابستہ ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنی صوفیانہ شاعری میں بڑے پتے کی باتیں بیان کی ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کے مسائل اور سماجیات سے ہے۔ بابا فرید صرف ایک صوفی شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک سماج سدھارک بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے اپنے دور میں پنپ رہی بہت سی سماجی برائیوں اور رسم و رواج کا بائیکاٹ کیا اور ہندستانی سماج کو اخوت کے دھاگے میں پرونے کا کارِ خیر انجام دیا نیز مشترکہ تہذیب و ثقافت کی بنیاد ڈالی۔

بابا فرید کی خدمات، پیغامات اور تعلیمات کو ہم کسی بھی طور سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے اردو شاعری کی وہ خدمت کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ان کی خدمات اور شخصیت کو بروئے کار لانے اور بازیافت کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے ''بابا فرید شخصیت اور کارنامے'' سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں بہت سے اسکالر اور اہل قلم نے اپنے پر مغز مقالے بابا فرید کے حوالے سے پڑھے۔ بابا فرید کی شخصیت اور فن پر پڑھے گئے سولہ مقالے آپ کے سامنے کتابی شکل میں حاضر ہیں۔ ان مقالات میں بابا فرید کی شاعری، شخصیت، فن، تعلیمات، سماجی خدمات، صوفیانہ رموز و نکات، عشق اور زندگی کا تصور، عوامی دوستی اور ملک و ملت جیسے امور و عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جو بابا فرید کی شخصیت اور فن کو اُبھارنے میں مشعل راہ کا کام کریں گے۔ سیمینار میں پڑھے گئے یہ مقالات بابا فرید گنج شکر کو خراجِ تحسین ہیں اور اردو ادب کے حوالے سے ایک خدمت کا جذبہ بھی۔

ان سولہ مقالات پر مشتمل کتاب بابا فرید کے تعلق سے ضرور ایسے پہلوؤں اور گوشوں کو روشن کرنے میں معاون اور کارگر ثابت ہوگی جس کو صاحب نقد اور صاحب ذوق ہی پہچان سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ بابا فرید کے متعلق بازیافت کرنے والے ضرور سیراب ہوں گے۔ تشنگی اور بازیافت کا عمل ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ تاہم ہماری یہ سعی اردو حلقوں میں اپنی موجودگی کا احساس کرائے گی۔

کشمیری لال ذاکر

حضرت بابا فرید کی تعلیمات

حضرت بابا فرید گنج شکر (متوفی ۱۲۲۵ء) کو چشتی سلسلۂ تصوف میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کی پوری زندگی عبادت، ریاضت اور فقیری کی جن منزلوں سے گزری، اس کی اپنی ایک الگ شان ہے۔ معروف عالم اور صوفی شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی آپ کی انہی خصوصیات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ریاضت، مجاہدے اور فقر و تجرید میں آپ کے بے پناہ انہماک کو سراہا ہے، اس کی تعریف کی ہے۔ (اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، ص ۵۸)

حضرت بابا فرید، ان کے چشتی دبستانِ تصوف اور دیگر صوفی سلسلوں سے وابستہ عظیم صوفیا کی تعلیمات میں انسانی مساوات، برابری، انسان سے محبت، اس کی دلجوئی اور اس کی خدمت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ بعض صوفیا نے تو یہاں تک کہا ہے کہ خدمت خلق ہی تصوف ہے، خدا تک پہنچنے کا ایک راستہ اس کی مخلوق کی خدمت سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ خدا انہیں دوست رکھتا ہے جو اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے محبت کرتے ہیں، ان کا دھیان رکھتے ہیں۔ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں، اشرف المخلوقات یعنی سب سے افضل انسان ہے، وہ کسی بھی رنگ کا ہو، کسی بھی مذہب کا ماننے والا

ہو، کوئی بھی زبان بولتا ہو، کہیں کا بھی رہنے والا ہو، اس انسان سے محبت کرنا، اس کا خیال رکھنا، اس کے کام آنا، صوفیا نے اسے عبادت کا درجہ دیا ہے۔

ہندستان میں چشتی سلسلۂ تصوف کے بانی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے ایک بار کسی نے پوچھا تھا کہ عبادت کی سب سے بہتر صورت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ: کسی بھوکے کو کھانا کھلانا اور مشکل میں پھنسے ہوئے شخص کی مدد کرنا ہی سب سے بہتر عبادت ہے۔

حضرت بابا فرید کے خلیفہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اسی بات کو زیادہ وضاحت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ: عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لازمی عبادت ہے جس کا نفع اور فائدہ صرف اس کے کرنے والے کو پہنچتا ہے۔ اس قسم کی عبادت نماز، روزہ، حج اور درود و تسبیح ہے۔ دوسری قسم متعدی اطاعت ہے۔ یہ وہ عبادت ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہنچے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانا، ان سے شفقت و پیار کرنا، اسے متعدی اطاعت کہتے ہیں اور اس کا ثواب بے شمار ہے۔[3]

عبادت بہ جز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

[عبادت خدمت خلق کے سوا کوئی چیز نہیں۔ صرف تسبیح، مصلا اور خرقہ پہننا عبادت نہیں]

محبوب الٰہی نے اسی خدمت خلق کی اہمیت پر ایک دوسری مجلس میں اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں کثرت سے مشغول رہنا، قرآنِ مجید کی تلاوت میں بہت مصروف رہنا، یہ سب کام بہت مشکل نہیں۔ ہر باہمت شخص کر سکتا ہے، بلکہ ایک ضعیف اور کمزور بوڑھی عورت بھی کر سکتی ہے، ہمیشہ روزہ رکھ سکتی ہے، رات کو جاگ کر عبادت کر سکتی ہے، قرآنِ مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے، لیکن مردانِ خدا کا کام کچھ اور ہی ہے۔''

''یہ کچھ اور کام'' خدمت خلق ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی تربیت پر حضرت بابا فرید نے خاص توجہ کی تھی۔ محبوب الٰہی کے درج بالا بیانات وعقاید اس تربیت کی

دین ہیں اور ان احساسات کے پیچھے کیا تصور کام کر رہا تھا، اسے سمجھنے کے لیے حضرت بابا فرید سے متعلق اس واقعہ کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔

ہوا یہ کہ اپنے مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے وصال کے بعد، بابا فرید، ہانسی سے دہلی آئے اور ان کے سجادہ پر رونق افروز ہوئے۔ تین ہی دن ہوئے تھے کہ سرہنگا نامی ایک شخص ہانسی سے دہلی آیا۔ اس نے بابا سے ملنے کی کوشش کی۔ دربان نے اسے حضرت بابا سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ حضرت بابا فرید ایک روز گھر سے نکلے تو سرہنگا کو ان سے ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ ان کے پیروں پر گر گیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: جب آپ ہانسی میں تھے تو آسانی سے آپ سے مل سکتا تھا، اب یہاں تو آپ کو دیکھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ سرہنگا کی اس گفتگو کا حضرت بابا پر بہت اثر ہوا۔ آپ نے فوراً ہانسی لوٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ نے محسوس کیا کہ وہ دہلی میں عوام سے دور ہو جائیں گے اور یہ اُن کے مشن کے خلاف تھا۔ ہانسی اور پھر اس کے بعد اجودھن میں حضرت بابا کو اپنا کام کرنے کا بہتر موقع ملا۔ ان کے اثرات پنجاب ہی تک محدود نہیں رہے، بلکہ شمالی ہند کے گوشے گوشے میں پہنچے۔

حضرت بابا فرید کی خانقاہ یا جماعت خانے کا نقشہ حضرت نظام الدین اولیاء نے کھینچا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: ہر آنے والے کو کھانے کی کوئی چیز دی جاتی، اگر کچھ نہ ہوتا تو پانی ہی پیش کیا جاتا۔ کھانا کھلانے میں اچھے برے، چھوٹے بڑے، مسلم غیر مسلم کا فرق نہیں کیا جاتا تھا۔

یہاں ایک بنیادی امر کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور اسی طرح دنیا والوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں دنیاؤں کے لیے رحمت ہیں۔ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ یہی وہ امن و سلامتی کا پیغام ہے جسے صوفیاء کرام نے بڑی شدّ ومدّ سے دنیا والوں تک پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ ہمارے صوفیا نے کہا اور کیا ہے وہ درحقیقت اسلام ہی کے پیغام کی صدائے بازگشت ہے۔

ادھر کچھ برسوں سے یہ تأثر پیدا کیا جا رہا ہے کہ صوفیا نے انسانی برابری، آپسی

بھائی چارے اور بلا امتیاز مذہب وملت، انسانیت کی بے لاگ خدمت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، وہ ان صوفیا کا اپنا فکر اور اپنی سوچ ہے جس کا اسلام سے تعلق نہیں۔ یہ ایک بے بنیاد خیال ہے جس کے پیچھے امن اور اسلام دشمن طاقتوں کے خطرناک منصوبے کام کرر ہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے صوفیاے کرام نے دین و دنیا میں جو بھی مقام حاصل کیا ہے، اور جس کی وجہ سے مختلف مذاہب کے ماننے والے ان کا احترام کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں، وہ دراصل اسلام ہی کی دین ہے۔

قرآن حکیم، احادیث پیغمبر اور اسلامی روایات میں انسان کی عظمت، انسانی برابری، آپسی محبت اور بھائی چارے، سماج کے کمزور طبقے کی خاص مدد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں سورۂ جمعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''خدا اپنی تمام مخلوق کا دھیان رکھتا ہے۔ اس کا پیغام آخر تک سب کے لیے ہے، پڑھے لکھے، ان پڑھ، دنیاوی اعتبار سے اونچے اور معمولی لوگ، کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ صرف وہی اس کے انعامات کا حق دار ہے۔ اس کی مہربانی اور رحمت کی بارش سب پر برابر برستی ہے۔''

پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ ساری مخلوق، خدا کی عیال، اس کا خاندان ہے۔ خدا کو وہ شخص سب سے پیارا ہے جو اس کے خاندان کے تمام افراد سے محبت کرتا ہے، ان کے لیے اچھے کام کرتا ہے۔

قرآن کریم کے اس فرمان اور پیغمبر اسلام کی اس حدیث کے بعد اب غور فرمایئے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے اس جملے پر جو آپ نے ایک اچھے انسان کی تعریف میں کہا ہے:

اول سخاوتی چون سخاوت دریا، دوم شفقتی چون شفقت آفتاب، سیوم تواضع چون تواضع زمین

[انسان کو دریا جیسی سخاوت، سورج جیسی محبت وشفقت اور زمین جیسی مہمان نوازی پیدا کرنی چاہئے]۔

دریا سے خدا کی ہر مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے، سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور گرمی

سب کو برابر پہنچتی ہے، زمین پر اچھے برے سب رہتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والی نعمتیں سب کے لیے ہیں۔ بندوں کے لیے یہ خدا کی رحمتیں اور نعمتیں ہیں۔ اور خدا بھی اپنی مخلوق میں انسانوں سے، جسے اس نے اشرف المخلوقات کا شرف بخشا ہے، دوسروں کے لیے اسی قسم کی رحمت اور مہربانی کے رویے کی توقع رکھتا ہے۔

مشہور صوفی بزرگ بایزید بسطامی نے یہی اسلامی نظریہ اور فکر ان اشعار میں بیان کیا ہے:

گر قرب خدا طلبی، دلجو باش
وندر پس و پیش خلق نیکو باش
خواہی کہ چون صبحِ صادق عنوان شوی
خورشید صفت باہمہ کسی یک رو باش

[اگر خدا سے قرب و نزدیکی چاہتے ہو تو دوسروں کا دل ہاتھوں میں لو، ان سے ہر حال میں مہربانی سے پیش آؤ، اگر صبح صادق کی طرح اپنے آپ کو ممتاز کرنا چاہتے ہو تو سورج کی طرح سخاوت کا رویہ اختیار کرو، جو کچھ ہو سکے دوسروں کو دیتے جاؤ]

یہی بات فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی نے بھی کہی ہے:

دل بہ دست آور کہ حج اکبر است
از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است

[لوگوں کا دل ہاتھوں میں لو، مشکل میں ان کے کام آؤ، یہ کام حج اکبر کا درجہ رکھتا ہے۔ دل ہزاروں کعبوں سے بہتر ہے۔]

سارے انسان برابر ہیں اور ان کی خدمت، سچی عبادت ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کا لازمی جز ہے۔

پیغمبر اسلام ایک بار رات گئے، اپنے خدا کے حضور میں یہ کہتے سنے گئے کہ:

اَللّٰھم اَنا شاہدٌ اَن النّاس کُلّھم اِخوۃ (ابوداؤد، ج ا، ص ۳۱۸)

الٰہی میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

تمام انسانوں کے آپس میں بھائی بھائی ہونے کی یہ شہادت، پیغمبر اسلام کے

رحمۃ اللعالمین ہونے کا ثبوت ہے۔ ایک پرامن سماج بنانے کے لیے ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اسلام نے فرمایا:

المومنُ مَالف، لا خیر فیما لا یالف ولا یولف (مشکوۃ)

حقیقی اور کامل مومن وہ ہے جو الفت و محبت کا خزانہ ہو۔ اس شخص میں کوئی خیر و بھلائی نہیں جو کسی سے محبت نہ کرے اور نہ اس سے کوئی دوسرا محبت کرے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا ہے:

اِرحَموا مَن فی الارض یَرحمکم من فی السّما

رحم کرو اہل زمین پر، رحم کرے گا تم پر آسمان والا

اسی سلسلے میں ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ:

لایَرحَم اللہ من لایَرحمُ النّاس

اللہ ان پر رحم نہیں کرتا، جو انسانوں پر رحم نہیں کرتے۔

پیغمبر اسلام نے آپسی بھائی چارے اور سماج کے کمزور طبقوں کی ہر ممکن مدد کے لیے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

لَیسَ المومن الّذی یشبع و جارہَ جائع اِلٰی جیھنہٖ (مشکوۃ)

وہ شخص مومن کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنا پیٹ تو بھر لیتا ہے، لیکن اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا رہتا ہے۔ اسی حسنِ سلوک پر پیغمبر اسلام نے ایک اور حدیث میں، جو احادیث کی معتبر کتابوں، صحیح بخاری اور مسلم میں نقل ہوئی ہے، ان الفاظ میں تاکید فرمائی ہے:

ایک مومن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے مہربانی، ہمدردی اور محبت و شفقت کا سلوک کرے گا (اس کی وجہ یہ ہے کہ) دنیا کے سارے انسان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جسم کے کسی بھی حصے میں درد و تکلیف ہو، سارا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے، ہر حصہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔

سعدی شیرازی نے انسان دوستی اور آپس میں محبت و بھائی چارے کا یہ درس ان اشعار میں نظم کیا ہے:

بنی آدم اعضای یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک گوہرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار
دگر عضو ہارا نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

عام انسانوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے بارے میں پیغمبر اسلام کی یہ حدیث بھی ہماری توجہ چاہتی ہے۔آپ نے فرمایا: لایدخل الجنة الا رحیم. قالوا یا رسول لله، کُلّنا رحیم. قال: لا. حتی یرحم العامة

جنت میں رحم دل کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا۔صحابۂ کرام نے کہا: حضور ہم سب رحم دل ہیں۔آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک عام مخلوق پر رحم نہ کرو۔

بیماروں کی مزاج پرسی کرنا، ان کی دوا دارو کرنا، اور اسی طرح بیماری سے نجات حاصل کرنے میں ان کی مدد کرنا اور راہنمائی کرنے کا اسلام میں بڑا درجہ ہے۔اس بارے میں ہماری جنگ آزادی کے معروف راہنما اور آزاد ہندستان کے سب سے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے قرآنِ حکیم کی اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں اک حدیث نقل کی ہے۔جس کا ترجمہ یہ ہے:

قیامت کے دن خدا اپنے ایک خاص بندے سے پوچھے گا: اے آدم کی اولاد! میں بیمار تھا، لیکن تو نے میری خیریت نہیں پوچھی، میری تیمارداری نہیں کی۔ یہ شخص تعجب سے جوب دے گا، اے خدا! یہ کیسے ممکن ہے، آپ تو دونوں جہانوں کے مالک ہیں، (بیمار کیسے پڑ سکتے ہیں؟) خدا جواب دے گا: تجھے یاد نہیں کہ میرے بندوں میں فلاں فلاں شخص بیمار ہوا تھا اور تیرے قریب ہی تھا، تو نے اس کی مزاج پرسی اور دیکھ بھال نہیں کی۔ اگر تو اس کی تیمارداری کرنے اس کے قریب جاتا تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔

سماج کے کمزور طبقوں کی مدد کے سلسلے میں حضرت بابا فرید کے خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنی ایک مجلس میں خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ حکایت

بیان کی:

حضرت ابراہیم اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک دستر خوان پر کچھ مہمان نہ ہوں۔ اگر کسی دن ان کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے کوئی موجود نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم مہمان کی تلاش میں دور دور تک جاتے تھے۔ ایک روز وہ دستر خوان پر تنہا تھے کہ ایک مشرک آ گیا۔ حضرت ابراہیم کو اسے کھانا کھلانے میں کچھ تردد ہوا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے کھانا کھلائیں۔ خدا کی طرف سے فوراً وحی آئی اور حضرت ابراہیم کو یاد دلایا کہ ابراہیم! یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جس شخص کو زندگی دے سکتے ہیں، تم اسے کھانا نہیں دے سکتے۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان احادیث میں صرف اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ بھلائی اور مہربانی کے سلوک کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ بلا لحاظ مذہب و ملت، ہر انسان کو مہربانی، مدد اور مشکل وقت میں دستگیری کا مستحق بتایا گیا ہے۔

بابا فرید سے منسوب گروگرنتھ صاحب میں اس اشلوک میں بھی یہی کہا گیا ہے:

फरीदा बुरे दा भला करि गुसा मनि न हदाई
देही रोगु न लगई पलै सभु किछु पाई

[اپنے ساتھ برا کرنے والے کا بھی بھلا کرو۔ من میں کرودھ نہ بڑھاؤ، ایسا کرنے سے شریر میں روگ نہیں لگتا اور سب پدارتھوں کی پراپتی ہوتی ہے]

بہر حال یہ ہیں انسان دوستی، آپسی بھائی چارے اور سماج کے کمزور طبقوں کی ہر طرح مدد کے بارے میں اسلامی تعلیمات، ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہمارے صوفیائے کرام نے خدمت خلق کا نہ صرف ایک مفصل پروگرام بنایا بلکہ اس پر عمل بھی کیا جس کی وجہ سے سماج کے کمزور طبقوں اور بے یار و مددگار لوگوں کو کچھ حمایت کرنے والے ملے، دستگیری کرنے والے میسر آئے اور ان کے دکھی دلوں کو کچھ راحت ملی۔ صوفیا کی تعلیمات پر نگاہ ڈالیے، تقریباً سب ہی نے انہی اسلامی تعلیمات کو عام کرنے پر زور دیا۔ مختلف الفاظ و انداز اور اپنے اپنے طریقوں سے انہی کا پرچار کیا ہے۔

حضرت بابا فرید نے اپنے مشہور خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا، کو سب سے پہلا سبق یہی پڑھایا تھا کہ اپنے دشمنوں کو خوش کرنا، چناں چہ محبوب الٰہی یہ اشعار پڑھا کرتے

ہر کہ مارا یار نبود، ایزد اورا یار باد
وان کہ مارا رنجہ دارد، راحتش بسیار باد
ہر کہ او خاری نہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گلی کز باغِ عمرش بشگفد، بی خار باد

[جو ہمارا دوست نہیں، خدا اس کا دوست ہو جو ہمیں تکلیف پہنچائے، اسے آرام و سکون ملے۔ جو دشمنی میں ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے، اس کی زندگی میں جو پھول بھی کھلے اس میں کوئی کانٹا نہ ہو]

بابا فرید نے اپنے اس جانشین کو یہ دعا بھی دی تھی کہ:

تو درختی شوی کہ در سایۂ تو خلقی بیا ساید

[تو ایسا درخت بنے جس کے سایے میں لوگ آرام و سکون کا سانس لیا کریں]

پچھلے دو تین برسوں میں دنیا اور دنیا والوں پر خوفناک قسم کا قہر نازل ہوا ہے۔ سونامی نے دنیا کے مختلف حصوں میں عام زندگی کو تہہ و بالا کر دیا ہے، لوگ آج تک اس کی وحشتناکیوں سے خوف زدہ اور لرزہ براندام ہیں۔ حال ہی میں کشمیر اسی نوعیت کے حالات سے دوچار ہوا ہے۔ وہاں زلزلے نے قیامت برپا کر دی ہے۔ وہاں کی بربادی کے واقعات جو سنتا ہے، اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ اس طرح کی آسمانی آفتیں کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے زمانے میں بھی اسی طرح کی ایک آفت انسانوں پر ٹوٹی تھی۔

سب جانتے ہیں کہ آپ دہلی میں غیاث پور میں رہتے تھے۔ وہاں ایک بار آگ لگ گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ آپ چلچلاتی دھوپ میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے آگ لگنے کا منظر اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ بجھ نہیں گئی۔ اسکے بعد آپ نے اپنے خادم خواجہ اقبال کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ جا کر گھروں کی گنتی کرے کہ کتنے آگ سے متاثر ہوئے ہیں اور ہر گھر والے کو چاندی کے دو تنکے، دو روٹیاں اور ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی پہنچائے۔ بستی کے لوگ اس وقت ظاہر ہے بہت پریشان اور دکھی تھے۔ جب خواجہ

اقبال کھانے کا خوان، پانی کی صراحی اور چاندی کے تنکے لے کر ہر ایک کے گھر پہنچے تو لوگ خوشی سے رونے لگے۔

دلسوزی کے ساتھ خدا کی مخلوق کی خدمت کے ایسے بے شمار واقعات ہمارے مشائخ کے احوال زندگی میں نظر آتے ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ مجروح انسانیت کے زخم بھرنے کے لیے صوفیا نے وہ سب کچھ کیا جس کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

خدا اور اس کی مخلوق سے محبت و رواداری کے اس درس کو، اس تعلیم کو بار بار خود یاد کرنے اور دوسروں کو سنانے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کی وجہ سے ہندستان جنّت نشان بنا ہے، لیکن بہ قول ایک شاعر:

ہیں خاکِ ہند میں کچھ نقش پا، اُن رہ نوردوں کے
ادب سے چومتے جن کو ہیں دشت و کوہسار اب تک
کوئی تھا گنج بخش اُن میں کوئی گنجِ شکر اُن میں
خزانے معرفت کے ہیں نہاں زیرِ زمین اب تک
ہوا ہندوستان جنّت نشان جن کی فضاؤں سے
نہ آئی جا کے اِن باغوں میں پھر فصلِ بہار اب تک

حضرت شیخ فریدؔ اور اُن کی شاعری

تصوف باطنی علم پر استوار ایک عالم گیر تحریک کا نام ہے جس کی تاریخ و روایت سینکڑوں سال پرانی ہے۔ اس کے تمام سلسلے پیغمبرِ اسلام تک پہنچتے ہیں جن پر قرآن مجید نازل ہوا اور جن کی سیرت پاک کے مثالی نمونے حدیثوں کی شکل میں صدیوں سے مینارۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ اہل تصوف کے یہاں رائج تصور ''چار پیر چودہ خانوادے'' کے مطابق رسولِ خدا کے بعد حضرت علی مرتضیٰ سے جن چار برگزیدہ ہستیوں تک باطنی علم پہنچا وہ حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، خواجہ حسن بصری اور خواجہ کمیل بن زیاد ہیں۔ یہ چار پیر کہے جاتے ہیں ان میں سے خواجہ حسن بصری سے نکلنے والی چودہ شاخیں چودہ خانوادے کہلاتی ہیں جن سے صوفیوں کے تمام سلسلے منسلک ہیں۔

لفظ صوفی کی تحقیق میں بہت بحثیں ہوئی ہیں اور اس کی تشریح و توضیح میں مختلف باتیں سامنے آئی ہیں۔ اکثر یہ سوال بھی اٹھایا جاتا رہا ہے کہ اسلام میں تصوف کا کیا مقام ہے؟ تصوف کے مخالفین عموماً یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ صوفی یا تصوّف کا کوئی ذکر نہ قرآن شریف میں ملتا ہے اور نہ ہی احادیثِ نبوی میں لہٰذا اسلام کے بنیادی عقائد سے تصوّف کا کوئی تعلق نہیں۔

تصوّف کیا ہے؟ اور کیا اسلام نے تصوّف اور صوفیا کی کوئی حیثیت تسلیم کی ہے، اس سوال کے جواب میں شیخ ابونصر سراج لکھتے ہیں۔

''ایک طبقہ اربابِ حدیث کا ہے، دوسرا فقہا کا اور تیسرا صوفیا کا۔ یہی طبقاتِ سہ گانہ اولوالعلم اور قائم بالقسط کہے جانے کے مستحق ہیں جو انبیا کے جانشین ہوتے ہیں.....صوفیا۔ انواع عبادات، حقائقِ طاعات اور اخلاقِ جمیلہ سے جن درجاتِ عالیہ اور منازلِ رفیعہ کو طے کرنے لگتے ہیں وہاں تک علمائے ظاہری اور فقہا اور اصحابِ حدیث کی رسائی بھی نہیں ہوسکتی۔'' (ابحوالہ: تصوف اسلام، علی گڑھ ۱۹۴۷ء طبع سوم، ص ۲۷)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی کتاب ''تصوف اسلام'' میں لکھتے ہیں کہ اکابرِ صوفیا کے نزدیک:

''تصوّف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباعِ کتاب و سنّت میں انتہائی سعی کی جائے۔ اُسوۂ رسول اور صحابہ کو دلیلِ راہ رکھا جائے۔ اور امر و نواہی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات وعبادات کو مقصودِ حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیتِ الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور سفائے معاملات و تزکیۂ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پائے''۔ تصوف اسلام (دیباچہ، عبدالماجد، طبع اول)، ص ۹۔)

برصغیر ہند میں صوفیا کے تمام سلاسل تصوّف کے اسی تصوّر کے حامل اور مذکورہ بالا بنیادی نکات پر عمل پیرا رہے ہیں۔ یہاں اسلامی تصوّف کی جو پذیرائی ہوئی اور اس نے خواص و عوام دونوں میں جو مقبولیت حاصل کی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تصوّف کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں تصوّف کے بنیادی افکار کسی نہ کسی شکل میں موجود و مروّج تھے۔ یہاں کے ہندو اور بودھ دونوں بڑے دھرموں میں تصوّف اور سلوک کے مختلف مراحل و منازل اپنی مخصوص شکل میں موجود تھے اور زمانۂ قدیم سے اہل ہند کی توجہ کا مرکز بنے رہے تھے۔ لہٰذا تصوف نو وارد ہونے کے باوجود ان کے لیے اجنبی ہرگز نہیں تھا۔ یہاں بھی سماج میں وہ دو طبقے موجود تھے جن میں سے ایک کے لیے مادی فوائد و لذات ہی حاصلِ حیات تھے اور دوسرے کے لیے دنیا اور اس کے سارے لوازمات اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتے

تھے۔ اوّل الذکر طبقہ گرہستھ کہلاتا تھا اور موخر الذکر سنیاسی۔ صوفیا کے یہاں ان طبقوں کے لیے سالک اور ساکن کی اصطلاحیں رائج رہی ہیں۔ ہندی فلسفے کے مطابق مایا فریب نظر ہے جو ذاتِ مطلق کو روح کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے اور اسی چیز کو صوفی حجاب سے موسوم کرتے ہیں۔ سانس پر توجہ مرکوز کرنے کے ضمن میں صوفیا کی فاس انفاس کی اصطلاح بدھ دھرم کے سلوک میں انسا س پناس کے نام سے جانی جاتی ہے اور یوگیوں کے یہاں پراتایام کہلاتی ہے۔ فرائض وعمل کے لیے تصوف میں جادۂ فقر کھلا ہوا ہے تو دوسری طرف کرم مارگ اور حق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک کو راہِ سلوک دکھائی دیتی ہے تو دوسرے کو گیان مارگ۔ دونوں جگہ عشق کو اہم مقام حاصل ہے۔ ترکِ دنیا کا تصور بھی دونوں جگہ اپنے اپنے انداز میں موجود نظر آتا ہے۔ ہندو یوگیوں کے مطابق کوئی بھی فانی انسان خواہشاتِ دنیا کو ترک کر کے غیر فانی ہو جاتا ہے اور برہما کی ذات میں گم ہو جاتا ہے، صوفیوں کے یہاں ترک کے چار درجے ہیں جنہیں اردو کے کسی صوفی شاعر نے ایک مصرعے میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ''ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک'' اولاً دنیا اور اسکے حصول کی خواہش کو دل سے نکال دیا جائے کیونکہ یہ خدا سے راست تعلق کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ یہ سلوک کا پہلا درجہ ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ عقبیٰ یعنی آخرت سنوارنے کا خیال بھی ترک کر دیا جائے اور جو کچھ صالح عمل ہو وہ بے لوث ہو اور اجر کی امید کے بغیر خلوصِ دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ کیا جائے تا کہ دل میں کوئی طمع باقی نہ رہے۔ تیسرا درجہ وہ ہے کہ یادِ خدا میں ایسا انہماک اور محویّت پیدا ہو کہ خدا کا خیال بھی دل سے جاتا رہے کیونکہ اس خیال کی موجودگی دوئی کی مظہر ہے۔ چوتھا اور آخری درجہ ترکِ ترک کا درجہ ہے یعنی ترک کو بھی ترک کر دیا جائے تا کہ عبد و معبود میں کوئی مغائرت باقی نہ رہے۔

ہندستان میں اسلامی تصوّف مروّجہ افکار و نظریات سے کب کب کہاں کہاں اور کیسے کیسے متصادم اور متاثر ہوا اور ان افکار و نظریات کو خود اس نے کس کس طرح اور کتنا متاثر کیا اور دوطرفہ عمل کے نتیجے میں دونوں طرف کیا کیا تبدیلیاں ظہور میں آئیں، یہ ایک علاحدہ اور اہم تحقیقی موضوع ہے جس سے قطع نظر کر کے یہاں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ گیارہویں صدی کے ہندستان میں تصوّف کی تخم ریزی کے لیے شمالی ہند بالخصوص پنجاب

کی سرزمین بالکل تیار تھی۔

ہندستان میں اسلامی تصوّف کا آغاز گیارہویں صدی کے آس پاس سب سے پہلے پنجاب کی سرزمین میں ہوا جہاں دنیا کے دوسرے خطوں سے شاہوں، سرداروں، فوجیوں، تاجروں، فنکاروں، عالموں اور عام لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ایک مدّت سے جاری تھا۔ نامور صوفی بزرگ شیخ علی بن عثمانی ہجویری جنہیں عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۱۰۴۵ء میں لاہور آکر وہیں بس گئے تھے۔ لاہور میں ہی انہوں نے اپنی گراں مایہ کتاب ''کشف المحجوب'' تصنیف کی جو فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر اوّلین کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

بابا فرید کا تعلق صوفیا کے چشتیہ سلسلے سے ہے۔ ہندستان میں اس سلسلے کے پہلے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی مانے جاتے ہیں جنہیں سلطان العارفین کہا جاتا ہے اور ان کی خداترسی اور انسان دوستی کے باعث خواجہ غریب نواز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دہلی کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جو عوام میں قطب صاحب کے نام سے مشہور ہیں، اُن کے مرید تھے۔ ایک بار جب خواجہ معین الدین اپنے مرید کے پاس دہلی پہنچے تو وہاں ان دنوں نوجوان شیخ فرید قطب صاحب کی زیرِ نگرانی سلوک کی سخت ترین منزلیں طے کر رہے تھے۔ دونوں بزرگ ان کی ریاضت اور نفس کشی سے بہت متاثر ہوئے۔ سلطان العارفین نے انہیں خلعتِ خاص اور قطب الاقطاب نے انہیں دستار سے نوازا۔ بابا شیخ فرید نے اپنے پیر و مرشد کے حکم پر اجودھن کے ویرانے میں بستی بسائی جو اب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے۔

صوفیا کی روای تکے مطابق بابا شیخ فرید نے بھی اپنے مرشدوں کا جادۂ فکر و عمل اپنایا۔ اسمیں سب سے اہم نسلِ انسانی کی وحدت کا وہ عقیدہ ہے جس کی رو سے تمام مخلوقاتِ عالم کو خدا کا کنبہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادنیٰ و اعلیٰ، عالم و جاہل، مفلس و منعم، ہندو مسلم، صوفی اور جوگی سبھی بلاتفریق و امتیاز ان کے یہاں آتے اور فیض پاتے تھے۔ کہتے ہیں کسی نے ایک بار بابا شیخ فرید کی خدمت میں ایک قینچی ہدیتاً پیش کی تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی بجائے مجھے سوئی اور دھاگہ دو کیونکہ میں کاٹنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آیا ہوں۔

باباشیخ فریدؒ نے ایک عمر تک عربی و فارسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ان زبانوں کو اظہار کا مستقل ذریعہ نہیں بنایا۔ انہوں نے اپنے روزمرّہ اظہارِ خیال کے لیے اس زبان کو اوّلیت اور اہمیت دی جو مقامی لوگوں کی مادری زبان تھی کیونکہ اسی زبان کے وسیلے سے وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے گہرا اور قریبی رابطہ قائم کر سکتے تھے، ان کے مسائل و مصائب سن سکتے تھے اور ان کے دکھ درد کو سمجھ سکتے تھے۔

باباشیخ فریدؒ نے یہ روایت غالباً خواجہ معین الدّین چشتی سے ورثے میں پائی تھی جو بلاشبہ ایسے اوّلین صوفی ہیں جنہوں نے عربی اور فارسی جیسی بڑی زبانوں پر وہ کامل دسترس رکھتے تھے، بالائے طاق رکھ کر اپنے اردگرد کے لوگوں سے رابطے کے لیے علاقے کی کم مایہ اور زیرِ تشکیل زبان سیکھی اور عام بول چال کے لیے اسی کو استعمال بھی کرتے رہے۔

باباشیخ فریدؒ کی مادری زبان ملتانی پنجابی تھی۔ صاحب علم گھرانے سے تعلق کے باعث ان کی تعلیم دستورِ زمانہ کے مطابق عربی اور فارسی میں ہوئی۔ ان دونوں زبانوں پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی ''فوائد الفواد'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''جب حضرت نظام الدینؒ اپنے پیرومرشد باباشیخ فرید کی خدمت میں پہنچے تو نہ صرف اپنی رسمی تعلیم پوری کر چکے تھے بلکہ علما میں ان کا بڑا نام تھا مگر اس کے باوجود پیرومرشد سے قرآن مجید کے چند پارے پڑھے اور اس درجہ معمولی سمجھی جانے والی چیزوں میں بھی کمال حاصل کرنے کی کوشش کی جیسے سورۂ فاتحہ میں ضاد کا تلفظ یا کسی دعا کے اعراب کی پیرومرشد کے ارشاد کے مطابق تصحیح۔'' (خواجہ حسن ثانی نظامی: تصوّف رسم اور حقیقت ۱۹۹۶ء، دہلی، ص ۵۸۔) عربی زبان پر باباشیخ فرید کی دسترس کا اندازہ مذکورہ بالا بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

بابافرید نے اپنی زندگی میں کئی سفر کیے اور دہلی، ہانسی اور اجمیر وغیرہ میں قیام پذیر بھی رہے۔ لہٰذا اس زمانے کی مروجہ ہندوی یا کھڑی بولی سے بھی ان کا واسطہ رہا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی مختصر کتاب ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں باباشیخ فرید سے منسوب ایک غزل نقل کی ہے جسے شمالی ہند میں عرصۂ دراز تک لوک گیت کا سا درجہ حاصل رہا ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

باتنِ تنہا کہ روی زیرِ خاک نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پندِ شکر گنج بہ دل و جاں شنو ضایع مکن عمر کہ ہیہات ہے

غزل کے ان مسلسل اشعار کے علاوہ ہندوی زبان میں متفرق اشعرا اور چند ملفوظات بھی بابا شیخ فرید کے نام سے منسوب ہیں جن کا ذکر حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخِ اردو میں کیا ہے۔ اگر چہ ہمارے محققین کو اب تک ایسے ثبوت دستیاب نہیں ہو سکے ہیں جن کی رو سے ان اشعار کو بابا فریدؒ کی تخلیق تسلیم کر لیا جائے لیکن ایسا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی بنیاد پر انہیں الحاقی کلام قرار دیا جائے۔ فکری اعتبار سے تو ان میں انھی صوفیانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے جو ''پند شکر گنج'' سے موسوم کیے جا سکتے ہیں۔

بابا شیخ فرید نے اپنی مادری زبان ملتانی پنجابی میں جو شاعری کی ہے اس میں اپنے متصوفانہ افکار و عقائد کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماجی سروکاروں کو بھی اہمیت دی ہے۔

بابا شیخ فرید کی ملتانی پنجابی کی کچھ تخلیقات مختلف راگوں کے عنوانات سے ملتی ہیں۔ مثلاً راگ آسا، راگ سوہی اور راگ سوہی للت جو آدی گرنتھ میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ''شیخ فرید کے سلوک'' بھی ہیں، جن میں سکھ مت کے تین مقدس گروؤں یعنی گرونانک، گرو امرداس اور گرو ارجن جی نے کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔

بابا شیخ فریدؒ علم کے بڑے قدرداں تھے۔ ان کے حلقۂ ارادت میں ایک صاحب شرف الدین نامی بڑے لائق اور باصلاحیت انسان تھے۔ ایک بار بابا نے ان سے پوچھا کہ تمہاری تعلیم کتنی ہے۔ انوں نے جواب میں کہا کہ اب تو سب کچھ بھلا دیا ہے تو بابا نے اس بات کو ناپسند فرمایا تھا۔

حضرت نظام الدین نے جب بابا شیخ فرید کے دستِ مبارک پر بیعت کی اس وقت تک وہ مکمل طور پر رسمی تعلیم کی تکمیل کر چکے تھے اور ہم عصر علما کے درمیان ان کی واضح شناخت قائم ہو چکی تھی ایک روز انہوں نے پیر و مرشد سے پوچھا کہ کیا میں پڑھنا چھوڑ کر

وظیفے اور مجاہدے میں مصروف ہوجاؤں تو باباصاحب نے فرمایا کہ میں کسی کو علمی مشغلے سے نہیں روکتا۔تم دونوں مشاغل جاری رکھو، وقت آنے پر ایک دوسرے پر خود بخود غالب آجائے گا۔

باباشیخ فرید کے یہاں موت کا تصور خوفناک، ناگوار، ناپسندیدہ نہیں اور ایسا ہونا مسلکِ تصوف کے عین مطابق ہے۔واضح رہے کہ صوفیا کے یہاں موت کو وصل سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی لیے ان کے یہاں وفات کے لیے وصال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔راگ سوہی میں سنسان کنویں کے کنارے تنہا کھڑی روح کا کوئی ہمدم و مونس نہیں، کوئی رفیق وہ دمساز نہیں وہ خدا ہی کو اپنا دمساز مان کر مقدس وصال کی طالب ہے۔راگ سوہی کے آخری دومصرعے ملاحظہ ہوں:

سنو شیخ فرید! روانگی کی اب فکر کرو　　　بس اب پو پھٹنے ہی والی ہے

اسی طرح راگ سوہی للت میں درشت لہجے کو سن کر روح کانپ رہی ہے۔جوانی بیت چکی ہے۔اب نہ تو چھاتی میں دودھ اتر سکتا ہے اور نہ پُر جوش بغل گیری ہی نصیب ہوسکتی ہے۔آخری مصرعوں میں باباصاحب کہتے ہیں:

فرید کہتا ہے میری روح کی سہیلیو! سنو
روح کا پرندہ ایک دن پھڑپھڑا کر اڑ جائے گا
یہ جسم خاک کا ڈھیر بن جائے گا

راگ آسا میں بھی باباصاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''حیاتِ ابدی دنیا میں کسی کو نہ ملی، جس جگہ آج ہم آسن جمائے ہوئے ہیں وہاں ہم سے پہلے کتنے ہی لوگ بیت چکے ہوں گے۔ یہ تن ایک دن ضرور خاک میں ملے گا۔سادہ سی قبر میں دفن کر دیا جائے گا۔اگر اس بات کا احساس ہوجائے کہ موت برحق ہے جس کے بعد واپسی ممکن نہیں تو اس بے مصرف دنیا کے پیچھے کوئی بھی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے۔''

موت کے بارے میں کئی شاعروں نے سوچا اور اظہارِ خیال کیا ہے ان میں قدیم یونان کی بے مثال شاعرہ سیفو بھی ہے جس نے موت کے حسن و جمال کو بہ نظرِ ستائش دیکھا اور پیش کیا ہے۔خواجہ شیخ فرید نے اپنے شلوکوں میں موت کو ''رخصتی کا مقررہ دن'' کہا ہے

اور اس دن کا آنا برحق ہے۔ روح دلہن اور موت دولہا ہے جو روح کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

بابا شیخ فرید کی پاک زندگی کے واقعات میں سے ایسے دو اہم واقعے ہم تک پہنچے ہیں جو موت کے حوالے سے ان کے رویئے کے مظہر ہیں۔ بابا شیخ فرید کی ایما پر جب ان کے برادرِ خورد شیخ نجم الدین متوکل ماں کو لے کر اجودھن آ رہے تھے تو راستے میں ماں کو شدید پیاس لگی۔ متوکل انہیں وہیں چھوڑ کر پانی کی تلاش میں گئے، جب واپس لوٹے تو ماں وہاں نہیں تھیں۔ تلاش بسیار کے بعد انہیں ایک جگہ جھاڑیوں میں کچھ انسانی ہڈیاں ملیں جنہیں وہ ماں کی ہڈیاں مان کر ایک بورے میں بھر کر بابا کے پاس اجودھن لے آئے۔ شیخ فریدؒ نے اسے مرضیِ حق تسلیم کر کے انہی ہڈیوں پر میت کی آخری رسوم ادا کیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شیخ فرید کی بیوی بدحواسی کے عالم میں بین و بکا کرتی ہوئی ان کے پاس آئیں اور بتایا کہ ان کے بچے نے بھوک سے دم توڑ دیا ہے۔ یہ سن کر بابا نے پرسکون انداز میں فرمایا کہ خدا کا بندہ مسعود خدا کے حکم کو کیوں کر ٹال سکتا ہے۔ بچہ مر گیا ہے تو اسے دفنا دو۔

یہ دونوں واقعات ان کے رضائے الٰہی پر راضی رہنے اور صبر و تحمل کی مثالیں ہیں۔ ایک بار آپ نے فرمایا تھا کہ جن کے واسطے رب نے تمام عالم پیدا کیا، جب انھی کو اس دنیا میں نہ رکھا تو ہماری تمہاری کیا بساط کہ جاودانی زندگی کا دم بھریں۔ وہ زندگی اور موت کو ایک دریا کے دو کنارے خیال کرتے تھے۔ اپنے ایک اشلوک میں انہوں نے کہا ہے کہ فرید مجھے موت اسی طرح نظر آ رہی ہے جیسے دریا کا دوسرا کنارہ نظر آتا ہے۔

بابا فرید کے متصوفانہ اقوال میں موت کو برحق مان کر اس زندگی کو جو حق تعالیٰ نے انسان کو ودیعت کی ہے بہتر سے بہتر طریقے سے گزارنے کی صلاح دی گئی ہے اور یہ صلاح پوری بنی نوع آدم کی فلاح سے تعلق رکھتی ہے کسی خاص قوم، مذہب یا فرقے سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں عالم گیر اپیل ہے۔

بابا شیخ فرید کی شاعری میں انسانی دکھ درد کو سمجھنے اور مداوا تلاش کرنے کی مخلصانہ سعی ملتی ہے۔ ان کے یہاں رواداری، انسان دوستی اور روشن خیالی کی اعلیٰ قدریں ملتی ہیں،

وہ انسان اور انسان کے درمیان کسی فرق کے قائل نہ تھے۔ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ بھی وہ اپنوں ہی کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کسی سے بھی ترش کلامی نہ کرو سب میں خدا موجود ہے۔ کسی کا دل نہ توڑو ہر ایک دل کو بیش قیمت موتی سمجھو۔ دنیا میں رہ کر آفات و مصائب سے بچے رہنا ممکن نہیں ہے لہٰذا صبر و تحمل کو کمان بناؤ اور تیر کا کام بھی اسی سے لو، خدا تمہارے نشانے کو خطا نہ ہونے دے گا کیونکہ جو صبر تحمل کی راہ اختیار کرتے ہیں اور مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہیں انھی کو قربِ ربانی حاصل ہوگا۔ بابا فرید درد و غم سے گریز کی بجائے اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر مردانہ وار قبول کر لینے میں ہی انسان کی عافیت سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں: ''فرید! کرب میرا پلنگ ہے اور مصائب اسکی ادوائن، فراق میرا بستر ہے۔ یہ ہے میری زندگی'' صوفیوں کا لباس پہن کر دینوی مفادات کے حصول میں مصروف رہنے والوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

فریدا! لوگوں کے کاندھوں پر مصلّٰی ہوتا ہے
اور بدن پر صوف
لیکن ان کے دلوں میں خنجر چھپا رہتا ہے
باہر سے وہ چمکیلے نظر آتے ہیں
لیکن ان کا باطن مانند شب سیاہ ہوتا ہے

(شلوک ۵۰)

بابا شیخ فرید سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک سچے درویش کی کیا پہچان ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''پردہ پوشی''.....اور اس ضمن میں چار بنیادی باتوں کی وضاحت کی جو کسی بھی درویش کے لیے از بسکہ لازمی ہیں۔ پہلی یہ کہ آنکھ کو نابینا کر لے تاکہ اوروں کی برائیاں دکھائی نہ دیں۔ دوسری یہ کہ کانوں کو بہرا کر لے تاکہ بُری باتیں سماعت میں داخل نہ ہوں۔ تیسری یہ کہ اپنی زبان کو گونگا کر لے تاکہ اس سے کوئی بری بات ادا نہ ہو اور چوتھی بات یہ کہ اپنے پیروں کو توڑ لے تاکہ نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لیے کہیں جانا ممکن نہ ہو.... یہ چاروں باتیں اسی صورت میں اختیار کی جاسکتی ہیں جب دل سے دنیا اور اس کی منفعت کے خیال کو زائل کر کے اسے ہمہ وقت یادِ خدا میں مصروف رکھا جائے۔ اس

جہانِ آب و گل سے رخصت ہوتے وقت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے پیرو مرشد خواجہ معین الدین چشتی نے ان سے از راہِ نصیحت فرمایا تھا:

''تصوف کی یہ نشانیاں جو میں تمہیں ودیعت کر رہا ہوں ایک امانت ہیں۔ یہ امانت ہمارے بزرگوں کو سینہ بہ سینہ خود رسول اللہ سے منتقل ہوتی آئی ہے۔ میں اس امانت سے سبک دوش ہوتا ہوں اب اس سے عہدہ برآ ہونا تمہاری ذمے داری ہے۔ اس فرض کو تم اس طرح انجام دو کہ عاقبت میں تمہیں پشیمانی نہ ہو۔

اے میرے عزیز بیٹے! خدا کے روشن ضمیر بندے سورج کی مانند چمکتے ہیں۔ یہ لوگ نورِ معرفت سے سارے عالم کو منور کرتے ہیں۔ اہلِ محبت کا جو مقام ہے وہ فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے، چار صفتیں انسان کو قیدِ نفس سے نجات دلاتی ہیں اوّل درویشی میں بھی تونگری کی شان ہو۔ دوم گرسنگی کی حالت میں بھی شکم سیر نظر آئے۔ سوم غم واندوہ کی حالت میں بھی شادماں رہے۔ چہارم خلق جتنی برائی سے پیش آئے، اسی کے برابر اس کے ساتھ نیکی کی جائے۔''[1]

خواجہ قطب الدین سے یہی تعلیم ان کے مرید بابا شیخ فرید نے وراثت میں پائی جو ان کے متصوفانہ فکر کی اساس بنی۔ بابا شیخ فرید کا دور کوئی کم پُر آشوب دور نہیں تھا۔ جس میں ایک مثالی انسان کی طرح زیست کرتے ہوئے انہوں نے نے اپنے افکار و اعمال کے ذریعے آدمی کو انسان بنانے کی سعی کی، اُسے حسنِ عمل، صبر و تحمل، رواداری، روشن خیالی، انسان دوستی اور انسانیت کا درس دیا۔ آج کا عہد بے حد ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بابا فرید کے دور سے کہیں زیادہ پُر آشوب دور ہے جس میں قومی، نسلی اور مذہبی منافرتوں کا بازار گرم ہے، جنگ و جدال اور دہشت گردی کے بھیانک سائے ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایسی صورتِ حالات میں بابا شیخ فرید کے متصوفانہ افکار کی معنویت، اہمیت اور ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

۱۔ سیر الاقطاب، منقول از بابا شیخ فرید گربچن سنگھ طالب (مترجم عتیق صدیقی) ص ۳۶۔۳۵۔

بابا فرید کی شاعری موت، عشق اور زندگی

بہت ہی سادہ سی بات ہے جو بابا فرید نے اپنی مختصر سی شاعری میں کہی ہے۔ بس ایک ہی بات کہ جو بیجو گے وہی کاٹو گے۔ جیسا عمل ہوگا ویسا ہی نتیجہ ہوگا۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے جتنی قوت کے ساتھ عمل کیا جائے گا اتنی ہی شدت کے ساتھ ردعمل ہوگا۔ تمام مذاہب، سارے پیغمبر سبھی گرو اس نکتے پر متفق ہیں اور اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اپنی اپنی قوم اپنے اپنے قبیلے، اپنی اپنی دھرتی اور وطن میں اور اپنی اپنی زبانوں میں لوگوں نے یہ پیغام سنا اور پیغام دینے والوں کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا۔ اپنے دلوں میں جگہ دی، اتنی جگہ دی کہ لوگ بعد میں آنے والی نسلوں کو بھی یہ پیغام سونپ گئے۔

لوڑے داکھ بجوڑیاں ککر بیجے جٹ
ہنڈ ھے اُن کتائیندا، پیدھا لوڑے پٹ (۲۳)

صدیوں کی مسافت کے بعد بھی ان الفاظ کی قوت میں کمی نہیں آئی، ان کی آب و تاب ماند نہیں پڑی۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ الفاظ کی ادائیگی صرف حلق سے اوپر کی جانب تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ہر لفظ جی کر دکھانا پڑتا ہے۔ یہی بابا فرید کی طویل زندگی کی

داستان ہے جو بمشکل ڈیڑھ سو (۱۳۰+۲۴+ (۸۳ گرنتھ سے باہر) اشعار یا دوہوں پر مشتمل ہے، جسے انہوں نے بانوے برس (۱۲۸۰-۱۱۸۸) لوگوں کے درمیان رہ کر جیا۔

ان کی شخصیت شاعری اور تعلیمات پر گفتگو اور تحقیق کے کئی زاویے ہیں۔ وہ وادی سندھ یعنی پنجاب، سرائیکی وسیب اور سندھ کے علاقوں میں چشتیہ سلسلے کے بانی تھے۔ اس خطے کی زبانوں سرائیکی، سندھی اور پنجابی کے پہلے شاعر تھے بلکہ اردو میں بھی انہیں یہ اولیت حاصل ہے۔ اور ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کرنے والے رہنما تھے جو برداشت، رواداری اور احترام انسانیت کے اصولوں کو ماننے والا تھا۔ وہ بین المذہبی تفہیم کو فروغ دینے والے اور تنگ نظری سے بچ کر زندگی کرنے کا گر سکھانے والے تھے۔ وہ عالم بھی تھے، لوگوں کے پیرومرشد بھی تھے، باعمل صوفی بھی اور باشعور شاعر بھی تھے مگر ان کا کمال یہ تھا کہ وہ جو کہنا چاہتے تھے اور کرنا چاہتے تھے اسے بڑی سادگی سے کہہ گئے اور کر گئے:

فریدا خاک نہ ندیے، خاکوں جیڈ نہ کوءِ

جیوندیاں پیراں تلے، مویاں اُپر ہوءِ

(ترجمہ: اے فرید! خاک کو برا نہ کہو، خاک کے برابر کوئی نہیں۔ جیتے جی یہ پیروں تلے اور مرنے کے بعد اوپر ہوتی ہے)

بابا فرید کی تعلیمات کا آغاز خاک سے ہوتا ہے، خاکساری سے ہوتا ہے، وہ بار بار بلاتے ہیں، پکارتے ہیں، آواز دیتے ہیں، اُن لوگوں کو جو رستہ بھول گئے ہیں، اپنے مرکز سے ہیٹ گئے ہیں، انہیں رفتگان کی مثالیں دیتے ہیں، ایسی مثالیں جو اچانک نیند سے بیدار کر دیتی ہیں مگر ان آوازوں میں کرختگی نہیں بلکہ دھیماپن ہے یہ درویشی کے گیرو رنگ میں رنگی ہوئی آوازیں ہیں۔

ان کے ہاں موت زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ موت زندگی کی محافظ ہے، ساتھی ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ بابا فرید کے ہاں موت زندگی سے زیادہ حسین لگتی ہے بلکہ حسین زندگی وہی ہے جو موت کے ساتھ ساتھ چلتی رہے۔ موت انکے ہاں ایک آئینے کی مانند ہے جس میں زندگی کا اصل چہرہ اپنی توانائی اور کمزوری سمیت عیاں ہوتا ہے۔ انہیں موسیقی کی آوازیں دمامے، نفیریاں، بھیریاں سب سنائی دیتی ہیں مگر

ان دل لبھانے والی آوازوں کے اسیروں، چھتر کے سائے میں رہنے والے لوگوں کو موت آ گھیرتی ہے اور وہ ویسی ہی قبروں میں جا سوتے ہیں جہاں یتیم اور بے آسرا لوگ بھی سوئے ہوئے ہیں۔

پاس و مامے، چھت سِر، بھیری سڈوڑڈ
جاءِ سُتے جیر ان میں، تھئے اتیاں گڈ (۴۵)

زندگی کے مناظر میں محلات، ماڑیاں، اونچے مکان، گلیاں اور چوبارے بنانے والوں اور اُن میں بسیرا کرنے والوں کا ذکر بابا فرید کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے مگر ان تمام آسائشوں اور زندگی کی تصویروں کا ذکر کرتے ہی انہیں دوہے کے اگلے مصرعے میں، یہ سارے سودے، جھوٹے سودے لگتے ہیں اور اُس جگہ کی فکر ستانے لگتی ہے جہاں آخری بسیرا ہوتا ہے:

فریدا کوٹھے، منڈپ، ماڑیاں، اُساریندے بھی گئے
کوڑا سودا کرگئے، گوریں آءِ پئے (۴۷)

فریدا کوٹھے ، منڈپ، ماڑیاں، اِت نہ لائیں چِت
مِٹی پئی اُوتو لویں، کوئی نہ ہوسی مِت (۵۷)

فریدا منڈپ مال نہ لاءِ، مرگ ستانٹی چِت دَھر
سا ای جاءِ سنبھال، جتھاہیں توں ونجنٹا (۵۸)

ان کی شاعری میں دنیا ایک سہانا اور من موہ لینے والا باغ ہے جہاں پنچھی مہمانوں کی طرح آئے ہیں اور انہیں صبحِ دم نوبت بجنے کے ساتھ ہی کوچ کر جانا ہے۔ یہ کوچ کا عمل زندگی کے ہر رنگ اور ہر وجود کے ساتھ جاری رہتا ہے:

فریدا پنکھ پروہنے، دُنی سُہاوا باگ
نوبت وجی صبح سُیو، چلن کا کر ساج (۷۹)

یہی شعر کئی صدیاں اور زمانے گزار کر سرائیکی کے

آخری بڑے صوفی شاعر خواجہ فرید کے ہاں یوں نیا ہوا تھا

پکھی پردیسی اُبھے سردے
دو دن دے خلقائیں

یہی مسافرت ہے، کوچ ہے جو جھیلوں میں بستے پکھیروؤں اور کنول کے پھولوں کے ساتھ ازل سے چلی آ رہی ہے:

چل چل کھیاں پنکھیاں، جنہیں وسائے تل
فریدا سُر بھریا بھی چلسی، تھکے کنول اِکل(۶۶)

وادیٔ سندھ کے جغرافیائی پس منظر میں سے بابا فرید دریاؤں کا ذکر کرتے ہیں، دریا اُن کے ہاں بہتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ابدیت کی علامت ہے، وہ ندی، دریا، کٹاؤ، درخت، کشتی، ملاح بھنور، بگلے، ہنس جیسے الفاظ کے ذریعے دریائی علامتوں میں سے فنا کی گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں موت دریا کے کٹاؤ کی طرح ہے جو اپنے کنارے کھا جاتا ہے، ان کناروں پر کوئی درخت یا آبادی ہو وہ کٹاؤ کی زد سے محفوظ نہیں رہتی۔ سرائیکی زبان میں اسے 'ڈھا لگنا' کہتے ہیں اگر دریا کے اندر کشتی تیر رہی ہے تو اُسے بھنور اور گرداب لپیٹ سکتے ہیں مگر ملاح کو خبردار اور ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ دن ہو یا رات ملاح کو کشتی کھینے کے لئے اپنی آنکھیں اور بازو تیار رکھنے ہوں گے ورنہ وہ فنا کے گھاٹ اتر جائے گا:

فریدا ڈکھاں سیتی ڈینہہ گیا، سولاں سیتی رات
کھڑا پکارے پاتنی، بیڑا کپر وات(۸۵)

لمی لمی ندی وہے کندھے کیرے ہیت
بیڑے نوں کپر کیا کرے جے پاتن رہے سچیت(۸۶)

کندھے اُتے رکھڑا، کچرک بنھے دِھیر
فریدا کچے بھانڈے رکھیے، کچرتانی نیر(۹۶)

فریدا موت دا بناں ایویں ڈسے جیوں دریاوے ڈھاہا

اگے دوزخ تپیا، سٹیا ہول پووے کیاہا(۹۸)

دریا کے کنارے ایک دوہایا شلوک ایک مکمل ڈرامے کی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے۔ چار مصرعوں میں زندگی کی یہ کہانی ایک اٹھکھیلیاں کرتے ہنس یا بگلے سے متعلق ہے جس پر ایک باز اچانک حملہ کرتا ہے تو اسے اٹھکھیلیاں بھول جاتی ہیں اور اُس کے ساتھ رب نے وہ کچھ کیا جو اُس کے وہم و گمان میں بھی کہیں نہ تھا۔ یہ زندگی کی ناپائیداری اور بے اعتباری کی شاعرانہ تمثیل ہے:

فریدا دریا دے کنھے بگلا بیٹھا کیل کرے

کی کریندے ہنجھ نوں اچنتے باز پئے

باز پئے تس رب دے، کیلاں وِسریاں

جو من، چت نہ چیتے، سوگالھیں رب کیاں(۹۹)

یہ درویشانہ صوفیانہ اور شاعرانہ بیان صرف قبروں کی تصویریں بنانے کے لئے ہی نہیں بلکہ فطرت کے رنگوں اور موسموں کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ خزاں کی رُت آتی ہے تو درخت کانپتے ہی، پتے جھڑتے ہیں اور جھڑ کر خاک ہوجاتے ہیں۔ چاروں اور ڈھونڈنے کے بعد بھی بابا فرید کو کہیں ہمیشہ رہنے کی مثال نہیں ملتی۔ فطرت اور موسموں میں سے یہ بیان سرائیکی، پنجابی اور سندھی شاعری کا سنگھار ہے:

فریدا رُت پھری، ون کنبیا، پت جھڑے، جھڑ پاہِ

چارے کنڈاں ڈھونڈھیاں، رہن کتھاؤں ناہِ (۱۰۲)

بھلا یہ ہر شے فنا کی طرف لے جاتی کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اُن کے عہد میں سیاسی اور سماجی بے ترتیبی، انتشار یا منگولوں کے حملوں کے سبب اور قتل و غارت گری کے سبب انسانی جان کی ارزانی نے انہیں یہ نیستی کا شاعرانہ مزاج دیا یا کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے؟ میرے خیال میں یہ تمام اشعار کہیں دنیا میں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کی طبقاتی تقسیم کے خلاف زیادہ واضح احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان اشعار میں موت، تلواروں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے پھوٹنے کے بجائے ہولے ہولے زمین برد ہوتے محلات،

عمارتوں، مکانوں اور جوانی سے بڑھاپے اور بڑھاپے سے موت کی طرف بڑھتے ہوئے انسانوں سے جنم لیتی ہے۔ جی ہاں! اس شاعری میں موت کا جنم، جوانی، طاقت، دولت اور جاہ وحشم سے ہوتا ہے۔ اور موت ان بیماریوں کا علاج بن کر آتی ہے اور اُسی قبر میں چھتر اور ڈھول باجوں والے کو بھی لے آتی ہے جس میں کوئی یتیم دفن ہوتا ہے۔ موت کوئی وحشتناک تصور نہیں بلکہ یہ تو رب کی کھجوروں کی طرح ہے جو پک گئی ہیں، یہ تو شہد کی نہروں کی طرح ہے جو کناروں تک بھر گئی ہیں:

فریدا رب کھجوریں پکیاں، ماکھیاں نئیں وہن
جو جو ونجن ڈینہڑا، سو عمر ہتھ پون(۸۹)

قبر تو غریب نمائی ہے، پیار کرنے والی ہے، بے گھروں کا گھر اور سہارا ہے اور مرے سے خوف کی کوئی بات نہیں ہے یہ تو سر کی چھت ہے:

فریدا گورنمانی سڈ کرے، نگھریا گھر آء
سر پر میں تھی آونا مرنوں نہ ڈریاہ(۹۳)

فریدا محل نسکھن رہ گئے، واسا آیا تل
گوراں سے نمانیاں، بیسن روحاں مل
آکھیں شیخا! بندگی چلن اج کہ کل(۹۷)

موت اُن کے لئے تو خوفناک ہوسکتی ہے جن کے گھروں میں آٹے کے ڈھیر ہیں مگر ان کے لئے نہیں جن کے گھر میں نمک تک نہیں، ان کے لئے تو موت بھرے ہوئے لوگوں سے برابری کا ذریعہ ہے:

فریدا اکنہاں آٹا اگلا، اکنہاں ناہیں لون
اگیہے گئے سنجاپسن، چوٹاں کھاسی کون(۴۴)

مگر موت بابا فرید کی شاعری میں صرف جسم کی موت نہیں، وہ اس سے کہیں آگے کی بات کرتے ہیں۔ وہ موضوع جو آگے چل کر پوری وادیٔ سندھ کی کلاسیکی شاعری کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے، برہا یا عشق کا موضوع ہے۔ بابا فرید کے ہاں برہا سب سے اعلیٰ انسانی

گن ہے جو اُسے عام زندگی سے اٹھا کر علویت کی طرف لے جاتا ہے اور جس تن میں برہا نہیں پلتی وہ قبرستان ہے:

برہا برہا آکھیے، برہا توں سلطان
فریدا جت تن برہانہ اُپجے، سوتن جانڑ مسانڑ (۳۶)

برہا، عشق، پریت کسی عمر کا محتاج نہیں، کسی رنگ اور نسل کا محتاج بھی نہیں۔ یہ سب کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ میں اپنے اس نکتے کو دہرانا چاہوں گا جو موت کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ موت صرف کسی سماج انتشار جنگلوں اور قتل و غارت یا گھوڑوں کے سُموں تلے کچل جانے والی مخلوق کے احوال کا بیان نہیں بلک بابا فرید کے نزدیک یہ امیر غریب بوڑھے جوان اور کالے گورے یا ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی کے لئے ایک ہی ہے بلکہ برابری کا پیغام ہے اور یہی نکتہ عشق میں انسانی مساوات کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ انسانی آزادی کو بابا فرید پریت یا برہا کی علامتوں کے ساتھ لے کر چلتے ہیں کہ رجھانے کے لئے جوانی یا کالے بالوں اور سفید بالوں یا بڑھاپے کی قید نہیں بلکہ 'سائیں' کے ساتھ پریت، پرہڑی یا عشق کرو تو تمہارا رنگ نیا ہو جائے گا۔

فریدا کالیں جنہیں نہ روایا، دھولیں راوے کوءِ
کر سائیں سیوں پرہڑی، رنگ نویلا ہوءِ (۱۲)

آپ سنواریں، میں ملیں، میں ملیاں سُکھ ہوءِ
فریدا جے توں میرا ہوءِ رہیں، سبھ جگ تیرا ہوءِ (۹۵)

کنت، ڈھولا، صاحب، سائیں، شوہ، دو علامتیں ہیں جو بابا فرید کے کلام میں انسان اور خدا کے درمیان ایک قابل اعتماد اور قابل تفہیم رشتہ تخلیق کرے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ جسے اُن کے بعد آنے والے شاعروں اور صوفیاء نے بھی اپنایا۔ یہ مذہب کو آسمانوں کے بجائے زمین پر لوگوں کے سونے جاگنے، چلنے پھرنے اور دکھ سکھ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی صوفیانہ شعری تحریک تھی جس کے سرخیل بابا فرید تھے یہ خالق اور مخلوق کے ملاپ کا سفر تھا جسے بابا فرید نے ابن العربی کے زمانے میں، اُس کے وحدت الوجودی فلسفے

کو پڑھنے سے غالباً پہلے ہی طے کر لیا تھا:

فریدا خالق خلق مہ خلق وسے رب ماہِ
مندا کس نوں آکھیے جاں تس بن کوئی نہِ (۷۵)

اس مقالے میں وحدت الوجود اور ویدانتی فلسفے کے درمیان ہم آہنگی کے نکات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس موضوع پر لائبریریاں بڑے اعلیٰ تحقیقی کاموں سے بھری پڑی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر ایسے نفیس تصورات اور خیالات زمانوں سے موجود تھے جن کی تطبیق داراشکوہ نے بھی مشرق وسطیٰ کے مذہبی اور فلسفیانہ افکار کے ساتھ کی تھی، مگر داراشکوہ سے صدیوں پہلے بابا فرید ان نفیس تصورات کو شاعری کے ذریعے یوں عام کر گئے کہ مذہبوں اور زمینوں کا فرق مٹ کر ایک پریت، عشق یا برہا میں سمٹ آیا جسے ہر آدمی اپنے من کی تار پر گا سکتا تھا۔ بابا فرید نے یہ خبر عام کی کہ جن آنکھوں نے جگ کو موہ رکھا ہے میں نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں، پہلے میری آنکھیں کاجل کی ریکھا کو بھی برداشت نہیں کرتی تھیں مگر اب ان میں پنچھیوں کا بسیرا ہے۔

فریدا جنہہ لوئن جگ موہیا، سے لوئن میں ڈٹھ
کجل ریکھ نہ سہندیاں، سے پنکھی سوئے بیٹھ (۱۴)

وادیٔ سندھ کی شعری تاریخ کے نابغہ شاہ لطیف بھٹائی نے بابا فرید کے اس شعر کے مصرعہ اول سے خوشہ چینی کرتے ہوئے صدیوں بعد کہا کہ 'اے ماں! میں نے انہیں دیکھا ہے، جنہوں نے پریتم کو دیکھا ہے:

موں سے ڈٹھا ماء، جنیں ڈٹھو پریں کھے

پریں، پریتم، ڈھول، کنت، صاحب، سائیں کہیں کہیں واضح ہو کر رب اور اللہ بن جاتا ہے جو بے محتاج اور بے پرواہ ہے۔ بس اُس کی طرف قدم بڑھانے کی دیر ہے وہ اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور سچا سنگھار بھی اُس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے:

فریدا کنت رنگا ولا، وڈاوے محتاج
اللہ سیتی رتیا، اے سچاواساج (۱۰۸)

فریدا دُکھ سکھ اِک کر، دل تھیں لاہ وِکار
اللہ بھاوے سو بھلا، تاں لبھی دربار(۱۰۹)

ڈاتیں صاحب سندیاں، کیا چلے تِس نال
اک جاگندے نہ لہن، ہکناں ستیاں ڈیئے اُٹھال(۱۱۳)

یہ جو صاحب کی دین ہے، اُس کے سامنے ہماری کچھ نہیں چلتی، کئی رت جگوں میں عمر گذار دیتے ہیں مگر کچھ نہیں پاتے مگر ایسے بھی ہیں جنہیں وہ نیند سے جگا کر عطا کر دیتا ہے بابا فرید کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کے پھل ہونے کی آس چھوڑ دی جائے وہ تو کہتے ہیں کہ میں اُن پنچھیوں کے قربان جاؤں جن کا بسیرا جنگل میں ہے، کنکر چگتے ہیں، تھلوں یا صحراؤں میں بستے ہیں مگر رب سے اُسے نہیں چھوڑتے۔

فریدا ہوں بلہاری تِنہاں پنکھیاں، جنگل جنہاں واس
کنکر چگن، تھل وسن، رب نہ چھوڑن پاس(۱۰۱)

پریت میں، لالچ نہیں، عشق تو خود انعام ہے، سفید ہو یا سیاہ، صاحب سدا موجود ہے بس دھیان کی ضرورت ہے، پریم لگائے سے نہیں لگتا، یہ تو خاوند کا پریم پیالہ ہے جو بھائے اُسے دے دے۔ عشق کے لئے درختوں جیسے صبر اور حوصلے کی ضرورت ہے، دل کے ہر شک کو مٹا کر اُس کی چاکری کیا چاہیے:

فریدا صاحب دی چاکری، دل دی لاہِ بھراند
درویشاں نوں لوڑیئے، رُکھاں دی جیراند(۶۰)

زندگی کرنے کا ہنر بابا فرید کے نزدیک غصے سے پاک ہونا ہے، عاجزی کا حرف سیکھنا ہے، بردباری اور صبر کا گُن حاصل کرنا ہے اور میٹھے بول بولنے کا منتر پڑھنا ہے۔ یہی وہ لباس ہے جو کنت کو بس میں لا سکتا ہے۔

کہ نسوا کھر، کون گُنڑ، کونسو منّیا منت
کونسو ویسو ہو کرے، جِت وَس آوے کنت
اے ترے بھینڑے! ویس کر، تاں وس آوی کنت (۱۲۶_۲۷)

موت، عشق اور زندگی بابا فرید کی شاعری میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ کمزور اور تنہا انسان کو بیان کرتے ہیں۔ جس کے پاس اپنے دفاع کے لئے دکھوں کی طاقت کے سوا کچھ نہیں، اسے اپنے غصے پر قابو پانا ہے اور دکھوں کے ادراک سے نئے رشتے تخلیق کرنے ہیں:

فریدا میں جانیا دکھ مجھ کوں، دکھ سبھا اے جگ
اُچا چڑھ کے ڈیکھیاں، تاں گھر گھر ایہا اگ

وہ جو عرفی نے کہا تھا کسے کہ کشتہ نہ شُد از قبیلۂ مانسیت! تو مقتولوں اور دکھ کے ماروں کے اس قبیلے کی رسمیں بھی بابا فرید نے وضع کیں۔ قدیم لوک دانش میں سے، آسمانی کتابوں میں سے اور بانوے برس کی زندگی کے قطرہ قطرہ کشید کیے تجربوں میں سے کلام کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جسم و جان کو غصے کا روگ نہ لگانا، بُرے سے بھی بھلا کرنا تو سب کچھ تمہارا ہے، تم ہی فتح مند ہو گے:

فریدا برے دا بھلا کر، غصہ من نہ ہنڈھاءِ
دیہی روگ نہ لگیئی پلے سبھ کجھ پاءِ (۷۸)

اور یہ گُر بھی بتایا کہ عقل مند ہوتے ہوئے بھی خود کو ناسمجھ سمجھنا، طاقت ہوتے ہوئے بھی کمزور رہنا، کچھ پاس نہ ہو تو خود کو خیرات کر دینا، یہی تو سچا بھگت روپ ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کسی کے ساتھ سخت نہ بولنا کیونکہ سچا مالک سب کے من میں بستا ہے، کسی کا دل نہ توڑنا کیونکہ یہ سارے انمول موتی ہیں:

مت ہوندی ہوئے ایاٹلا تان ہوندے ہوئے نِتانا
ان ہوندے آپ ونڈائے۔ کو ایسا بھگت سڈائے (۱۲۸)
اِک پھکا نہ گالھائیں، سبھنائیں میں سچا دھنی
ہیاؤ نہ کہیں ٹھاہیں، مانک سبھ اَمولویں (۱۲۹)

آخری بات جو بابا فرید کا کام پڑھتے ہوئے میں نے پائی، وہ وصال کی بات ہے۔ بدلتے موسموں کی بات ہے، کوئی موسم مستقل نہیں ہے، کوئی فراق ہمیشہ رہنے والا نہیں، کاتک کے مہینے میں کونجیں آتی ہیں چیت کے مہینے میں جنگل پھولوں کی آگ سے

دہکنے لگتا ہے، ساون میں بجلیاں لسکتی ہیں اور سرما کا موسم وہ موسم ہے جب پریتم کے گلے میں بانہیں بھلی لگتی ہیں:

کاتک کونجاں، چیت ڈوَن، ساونْ بجلیاں
سیالے سوہندیاں، پرگل بانہڑیاں (راگ آسا۔٦)

حوالہ متن:

بابا فرید کے کلام کے حوالوں کے لئے درج ذیل دو بنیادی ماخذ استعمال کئے گئے ہیں'

١۔محمد آصف خان آکھیا بابا فرید نے، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، تیسرا ایڈیشن ١٩٨٩ء

٢۔www.Srigranth.org

بابا فرید اور برصغیر میں روحانی اقدار کا احیائے نو

یہ زمانہ جو اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے، سائینس اور تکنالوجی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ سیاروں پر انسانی بستیاں بسانے کے پروگرام پر سنجیدگی سے عمل شروع ہو گیا ہے۔ اس دور کا انسان مادی سطح پر خوشحالی کی نئی جہتیں چھوتے ہوئے اپنی کامیابیوں پر شاداں ہے۔ تاہم اِن فتوحات اور کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اِس انسان کو سماجی، روحانی اور اخلاقی قدروں کے انتشار کا شدید سامنا بھی ہے۔ یہ انتشار، دھیرے دھیرے اب ایک بحران کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں بڑھتی ہوئی سیاسی غارت گری، بین المذہبی اور بین الثقافتی مخاصمت اور ٹکراؤ، مذہبی شدت پسندی سے پیدا شدہ تشدد اور پھیلتی ہوئی نفرت، اسانی سلامتی اور امنِ عالم کے لئے نئے خطرات کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔

سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد، نام نہاد یک قطبی دنیا (Unipalar world) میں، سامراج اور نوآبادیت، ایک ہی صورت اختیار کر کے عالمی سطح پر ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔ دریں اثنا مغربی دانشکدوں میں وضع کردہ نیا شرانگیز نظریہ، تہذیبوں کا تصادم،

(Clash of civilizations)، جس کی پشت پناہی بارسوخ اور باوسائل عالمی قوتیں کر رہی ہیں۔ عالمی امن، انسانی سلامتی، عالمگیر روحانی اور اخلاقی اقدار اور عالمی تہذیب کے کثیر رنگ موزیق (Mosaic) کو پارہ پارہ کرنے کی مستقل سعی میں مصروف ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مغرب میں بتدریج بڑھتے ہوئے روحانی اور اخلاقی خلاء پر وہاں کے اہل علم اور دانشور حضرات برابر اپنی تشویش کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خلاء کو پورا کرنے کے لئے وہاں صوفیوں کے ارشادات اور تحریروں کی طرف رجوع ہونے لگا ہے۔ مغرب، بالخصوص امریکہ اور یورپ میں مولانا رومؒ اور حافظ شیرازی کی شاعری کے انگریزی تراجم خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔

(۲)

برصغیر پچھلی تقریباً چھ دہائیوں سے کئی صبر آزما طوفانوں سے گذر چکا ہے۔ برصغیر کی تقسیم در تقسیم نے نہ صرف علاقوں کی تقسیم کی، بلکہ انسانی رشتوں اور دلوں کو بھی منقسم کر کے رکھ دیا۔ المیہ یہ ہے کہ اس تقسیم در تقسیم کے بعد متعدد تصادم، انسانی احساسات اور جذبات کو چیرتے ہوئے ہماری مشترکہ روحانی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار پر بھی اثر انداز ہوئے۔ آج برصغیر میں مذہبی بنیاد پرستی، شدت پسندی، مسلکی اور گروہی عصبیت کے رجحانات ایک کثیر سروں والے دیو (Hydra headed monster) کی شکل اختیار کر کے سماجی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی بیخ کنی کے درپئے ہیں۔ سماجی اور انسانی رشتوں کی عمارت، جن روحانی اور اخلاق اقدار کی بنیادوں پر صدیوں سے ایستادہ ہے، آج متزلزل ہو رہی ہے۔ اپنے اپنے علاقوں اور خطوں کی وحدت اور یک جہتی کو تسلیم کرتے ہوئے، آج اُن روحانی اور اخلاقی اقدار کے احیائے نو کی شدید ضرورت ہے، جو انسانی دلوں کو محبت، اخوت اور رواداری کی نرم، لیکن مضبوط دھاگوں میں باندھتے ہیں۔ آج اُس عالمگیر روحانی جذبہ کو تازہ رُو کرنے کی ضرورت ہے، جو دلوں کو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں۔

(۳)

بابا نانک نے تقریباً سولہوی صدی کے آغاز میں برصغیر کی روحانی اور اخلاقی تشکیل نو کا بیڑا اٹھایا۔ اس مشن کے سلسلے میں اُنہوں نے برصغیر کے روحانی سرچشموں کی

نشاندہی بھی کی اور ان سے فیض بھی حاصل کیا۔ بابا نانک نے اپنے دور کے ہم عصر صوفی حضرات کو نظر انداز کر کے بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے فرمودات اور فلسفۂ حیات کی طرف ہی کیوں رجوع کیا؟ ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ بقول پروفیسر محمد مجیب، سولہویں صدی میں صوفی بزرگوں نے 'فقر'، چھوڑ کر 'اوقاف' میں اپنی عافیت تلاش کی تھی۔ صوفی روایات کے برخلاف امراء وسلاطین سے اپنے تعلقات استوار کیے تھے اور صوفی سلسلوں کے 'پشتینی' بنانے بدعت کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ صورتِ حال بابا نانک کے روحانی مشن سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تاہم وہ برصغیر میں پانچ سو سال پر پھیلی ہوئی عظیم صوفی وراثت کو، اپنے روحانی اور اخلاقی مشن کے ساتھ، ایک بنیادی جز کی حیثیت سے شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس تجسس نے اُن کو روحانی رشتہ بابا فرید سے جوڑ دیا۔ بابا فرید کا عارفانہ کلام آج تک صرف گروگرنتھ کی وساطت سے ہی محفوظ ہے۔ گروگرنتھ کی تشکیل ۱۷ویں صدی (۱۶۰۴ء) میں پانچویں سکھ گرو، ارجن دیو جی، کے ہاتھوں پائی۔ اس میں بابا فرید کے ۱۱۲؍اشلوک اور ۴ شبد موجود ہیں۔ گروبانی میں اِن اشلوکوں اور شبدوں کے کیرتن آج بھی ہمیں برصغیر کی روحانی اور اخلاقی وحدت کا احساس دلاتے ہیں۔

(۴)

اس میں شبہ نہیں ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے برصغیر میں باقاعدہ طور پر صوفی سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ڈال دی۔ لیکن اس سلسلہ کو منظم اور مربوط کرنے کا کارنامہ صرف بابا فرید الدینؒ نے انجام دیا۔ بابا فریدؒ کے متعلق خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمایا تھا کہ "بختیار، تم نے ایک ایسے شہباز کو گرفتار کر رکھا ہے، جس کا مقام سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے ہے"۔ بابا فرید کی تعلیمات، فلسفہ، شاعری اور روزمرہ کی زندگی ایک ایسے ضابطۂ حیات کا نمونہ ہیں جو اللہ سے محبت و سرشاری، خدمت خلق اللہ، انسانی برادری ورواداری، اخلاق اور صبر وقناعت کی صفات سے مزیّن ہے۔

بابا فریدؒ کی حیات، ان کے فلسفہ اور تعلیمات سے صاف ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کی خوشنودی اور معرفتِ حق اُن کا منتہاٗ مقصود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جستجو انفرادی عمل نہیں ہے، بلکہ اپنے اعمال اور کردار سے وہ اس کو ایک اجتماعی جستجو کی شکل

عطا فرماتے ہیں۔ اس کاوش میں ہر انسان کو شامل کر کے وہ اُن کی زندگی کے اعلیٰ مقصد کا تعین بھی کرتے ہیں۔ یہ جستجو مقامی سے عالمی سطح پر منظم ہو کر ایک عالمگیر روحانی تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بابا فرید کے نزدیک ہر انسان، مذہب، رنگ، نسل، مسلک اور سماجی رتبہ کی تخصیص کے بغیر اس جستجو کا ایک جز لاینفک ہے۔ یہ بابا فرید کا عظیم کارنامہ ہے۔

بابا فریدؒ کے دربار میں ہندو، مسلمان، امیر و غریب کا ہجوم رہتا تھا۔ انکے بارے میں جتنا کچھ بھی تحریروں میں دستیاب ہے، اُس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ انہوں نے رسمی طور پر باقاعدہ کسی مخصوص فلسفہ یا طرزِ فکر کی تبلیغ کی ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ اُن کی حیات، اخلاقی اور روحانی اقدار کی ایسی تفاسیر تھی، جو بے اختیار لوگوں کو ان کی طرف کھینچ لیتی تھی۔ سماج اور اس میں رہنے والے انسانوں کی اصلاحِ احوال کا اس سے اور کوئی موثر ذریعہ نہیں ہے۔

بابا فریدؒ کے دربار میں ہر قسم کے لوگ، طرح طرح کے مسایل اور سوالات لے کر حاضر ہوتے تھے۔ فوائد الفواد کے مطابق ہندو جوگی بھی ان کے دربار کی زینت ہوا کرتے تھے۔ وہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ ہر نئے آنے والے سے اس طرح ملتے تھے گویا برسوں کی شناسائی ہو۔ فوائد الفواد میں درج ہے:

''اگر کسے بخدمت بیامدے کہ ہرگز نیامدہ بودے، ودیگرے نیز حاضر بودے کہ اوا ستثناً چندیں سال بودے، در محاورہ باہر دو برابر بودی، و در تلاطف و توجہ باہر دو متساوی''

(نووارد اور برسوں کا خدمت گذار، آپ کی نظروں میں یکساں تھے اور مہربانی و توجہ کے وقت دونوں مساوی ہوا کرتے تھے)

بابا فریدؒ ایک چشمۂ خیر برکت تھے۔ اِس چشمہ سے فیض حاصل کرنے کے لئے عام و خاص کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اسی لئے وہ کسی معاملے میں کوئی رازداری نہیں برتتے تھے۔ بقول شیخ بدرالدین اسحاق، جو خادمِ خاص کی حیثیت سے ہمہ وقت اُن کے ساتھ رہے:

''.....در خلا و ملا، یک سخن بودے، ہیچ وقت مرا در خلا سخن نگفت یعنی ظاہر و باطن یک روش داشت...'' (خلوت اور جلوت میں ایک ہی بات کہتے اور کرتے۔ مجھ سے کبھی علیحدگی میں ایسی بات نہیں کہی، جو ظاہر میں نہ کہہ سکتے ہوں۔)

اس جذبہ اور طریقۂ کار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ بابا فریدؒ کے تئیں عوام کا اعتماد اور جذبۂ تشکر کس قدر محکم رہا ہوگا۔ اس لحاظ سے جب ایک شخص نے بابا فریدؒ کی خدمت میں قینچی پیش کی تو انہوں نے معنی خیزی سے فرمایا ''مجھے سوئی دو، میں کاٹتا نہیں جوڑتا ہوں''۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس جذبہ اور طریقۂ کار کے فقدان نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مذہبی رہنماؤں اور علما اور عوام کے بیچ عدم اعتماد کی ایک وسیع خلیج پیدا کی ہے۔

(۵)

بابا فریدؒ معرفتِ حق کی جستجو میں انسان کو عرفان و آگہی کے ادراک کا سلیقہ حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس لئے وہ 'قلب' کی مرکزیت پر زور دے کر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اپنے من کو تشکیک، یاس اور توہمات کے جالوں سے صاف کر کے ہی انسان خالقِ حقیقی سے شناسائی کے مدارج طئے کر سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک خالقِ حقیقی کی آماجگاہ یہی من ہے:

جنگل ڈھونڈیں سنگھنا، لے لڑیا نہ دت
تن حُجرہ درگاہ دا تس وچ جھاتی گھت

(اپنی عبادت کے لئے گھنا جنگل کس لئے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ تیرا تن ہی اللہ کا حجرہ ہے۔ اِس کے اندر نظر ڈال، محبوب حقیقی اپنے تن کے حجرے کے اندر ہی بیٹھا مل جائے گا)

دل اندر دریاؤ فریدا کنڈھی لگا کیہ پھریں
ٹُھبی مار منجھا ہیں مجھوں ہی مانگ لیہسی

(اے فرید! عشق کا دریا تو دل ہی کے اندر ہے، تو باہر کنارے کیا کرتا پھرتا ہے۔ اپنے دل کے دریا کے اندر غوطہ لگا، تجھے محبوب حقیقی وہیں مل جائے گا۔)

جے توں ڈھجیں حج حج بھوای جیا میں
لاہ دلے دی لج سچا حاجی تا تھیویں

(اگر تو حج کرنا چاہتا ہے، یہ تیرے اپنے دل میں ہی ہوسکتا ہے، اگر اپنے دل پر پڑے ہیرے جواہرات ہٹا کر محبوب حقیقی کا دیدار کر سکے، تب ہی صحیح معنوں میں سچا حاجی کہلائے گا)

حضرت نظام الدین اولیاؒ جو بابا فرید کے خلیفہ تھے اور جن کی تربیت اُن ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی، نہایت خوبصورتی سے 'نفس' اور 'قلب' کے فرق کو بیان کرتے ہیں۔ بقول اُن کے ''در نفس ہمہ خصوتست وغوغا وفتنہ و در قلب سکوت ورضا وملاطفت'' (یعنی نفس میں غوغا وفتنہ ہے اور قلب میں سکوت)۔ بابا فریدؒ نفس کو قابو کر کے قلب کو سنوارنے کی تلقین کرتے تھے۔

(۶)

بابا فریدؒ کی سالکوں کو یہ قطعی ہدایت تھی کہ وہ اُمرا اور سلاطین سے کوئی رسم وراہ نہ رکھیں۔ اس تنبیہہ پر چودھویں صدی تک سختی سے عمل درآمد ہوتا رہا۔ اس اصول پر عمل آوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفی مسلک کو عوامی مسلک کی حیثیت سے قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح 'سیر الاولیا' میں بابا فریدؒ کے جماعت خانہ کا بڑا اچھا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ جماعت خانہ کے لوگ دن بھر مشقت کرتے تھے۔ لکڑیاں اور کریلے تو جنگل سے لاتے تھے، لیکن نمک کو، جسے وہ اپنی مشقت سے حاصل نہ کر سکتے، لوگوں کی طرف سے قبول کر لیا جاتا تھا۔ 'خانقاہ' کا تصور بھی اسی جماعت خانہ کے اصولوں پر مبنی تھا۔ خانقاہ نے بعد میں جو شکل اختیار کی اور علامہ اقبال نے جس کو اپنی ہدف کا نشانہ بنایا، وہ ہرگز وہ خانقاہ نہ تھی، جس کی بنیاد بابا فریدؒ نے جماعت خانہ کی حیثیت سے ڈالی تھی۔ اس جماعت خانہ کے لنگر کی شبیہہ آج کل سکھ گردواروں کے لنگر میں دکھائی دیتی ہے۔

بابا فریدؒ نے اپنے معتقدین اور سالکین کو رہبانیت کا درس نہیں دیا۔ ان کے اعمال وافکار سے یہی ظاہر ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیاوی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتی نہیں جا سکتی ہے۔ تاہم ان ذمہ داریوں کو انجام دہی ذکرِ حق اور اللہ کے اصولوں کی پیروی میں حایل نہیں ہونی چاہئے۔ ویدوں کا فلسفہ ہے کہ ہمیں پانی میں رہ کر بھی پانی سے باہر رہنا ہے۔ بابا فریدؒ تنہائی میں اکثر اس شعر کا ورد کرتے:

بگیر رسم تعلق دلاز مرغابی
کہ اوز آب چو برخاست خشک پر برخاست

اس شعر کو انہوں نے ایک اشلوک میں یوں بیان کیا ہے:

کلر کیری چھپڑی آء اُتھے ہنجھ
پنجو بوڈن نہ پیویں اُڈن سندی ڈنجھ

(زمین کے جوہڑ میں کچھ ہنس آن اُترے ہیں، وہ اس جوہڑ کے غلیظ پانی میں اپنی چونچ ڈبوتے تو ہیں لیکن اسے پیتے نہیں۔ انہیں تو وہاں سے اُڑ جانے کی شدید خواہش ہے)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ ''دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے''۔

قرآن حکیم میں بھی ارشاد ہے، رِجالٌ لّا تُلھیھم تجارۃٌ ولا بیعٌ عن ذکر اللہ

(جن کو خرید و فروخت وغیرہ دنیاوی اشغال ذکرِ خدا سے غافل نہیں کرتے)(۲۴:۳۷)

(۷)

بابا فریدؒ کی روحانی تحریک کے محور عام انسان ہیں۔ ان عام انسانوں کے قلوب کو ذکر، فکر اور فقر کے موثر کیمیاوں سے سنوار کروہ انہیں گیسوئے گیتی سجانے کی دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ اس دعوتِ عمل سے وہ زمان و مکاں کی حدوں کو پھلانگتے ہوئے، کائنات کو اُس رنگ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، جس کی آزمائش کی مہم اور ذمہ داری اللہ نے انسان کو تفویض کی ہے۔ بابا فریدؒ کے چیلنج کم نہ تھے۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے، اُنہوں نے اپنے فرمودات اور اشلوکوں میں سیاہ لبادوں میں ملبوس نقلی فقیروں، ہزار دانہ تسبیوں سے لیس لمبے جبوں سے آراستہ شیطان درویشوں اور منافقین کا ذکر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ جہلا کی یہ نسل آج بھی پوری قوت کے ساتھ ہماری گردنوں پر سوار ہے۔ ان میں کچھ حضرات طوق زرین سے آراستہ آج بھی دندناتے پھر رہے ہیں۔ ان کی عیاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں پھر بابا فریدؒ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ برصغیر میں روحانی اور اخلاقی اقدار کے احیائے نو میں بابا فریدؒ کی تعلیمات اور فرمودات ایک مینارۂ روشن ہیں۔ آج کل کے علاقائی اور بین الریاستی حالات کے پیشِ نظر، بابا فریدؒ کی تعلیمات اور فلسفہ، بین المذہبی اور بین الثقافتی مکالمے میں حرفِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک عظیم صوفی شاعر: بابا فرید

بابا فرید کی شاعری کا آدھار تصوف اور ولسفۂ وحدت الوجود تھی۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے خدا اور بندے کے بیچ فرق کو کم کرنے کے لئے اپنی شلکشا کا پرچار کیا۔

بابا فرید مادیت پرستی کی دنیا کو تیاگتے ہوئے اپنایت کا احساس جاگزیں کرتے ہیں۔ بابا فرید ایک عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ نے

''اللہ میرے دل دے اندر
میں مومن حق قلندر''

کا نعرۂ مستانہ لگایا۔

میں صوفی ازم کے طفل مکتب کی حیثیت سے علم و آگہی کی ان منازل پر تو رسائی نہیں حاصل کر سکا جہاں پر یہاں کے سہ بھاگی متعلق ہیں لیکن پھر بھی صوفیائے کرام کے بارے میں میرا Conclusion یہ ہے کہ وہ لوگ بلا رنگ و نسل اور مذہبی امتیازات کی تمیز کئے بغیر عام انسان کے لئے پریم اور مثبت خیالات کے حامل تھے۔ صوفیائے کرام بالخصوص بابا فرید نے حق اور سچ کی بات کی۔ اپنے دور کے سلاطین اور ارباب بست و کشاد کے سامنے

حق کی بات اور تنقید نہ کرنا، ظلم کے برابر قرار دیا۔ حق کیا ہے؟ یہ روشنی کا اثبات اور منافقت کی نفی ہے۔ تیرہویں شتابدی میں ہندوستان کی سرزمین پر طلوع ہونے والا سورج بابا فرید کی شکل میں حق اور امید کا پیغام لے کر آیا۔ روحانی عقیدت جب آپ خدا کی اور اُس طاقت کی نشاندہی کی جو اکیلی اس کائنات کے شمس وقمر کو منظم طریقہ سے چلاتی ہے۔ تو اقتدار کے ایوانوں میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ دنیاوی خداؤں کے پجاری واحد خدا کی تبلیغ پر خطرہ محسوس کرنے لگے۔ لیکن آپ نے سچ کی بات کو اسی طرح پیش کیا جیسے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے سامنے پیش کیا۔ بابا فرید کا تعلق زندگی کے نظم وضبط اور عوام کے مفاد سے تھا۔ مساوات کی تبلیغ آپ کا مطمعٔ نظر تھا۔ جب آکاش ایک، دھرتی ایک پانی دریا سمندر برکھا ایک ہیں تو پھر انسانیت میں اونچ نیچ کیوں۔ ذات، دولت اور شہرت کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق نہیں ہونی چاہیے۔

بھگتی تحریک کا جنم بابا گورونانک کی زمین سے ہوا اور صوفیا نے اس کو بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

۱۲ برس ہانسی، ہریانہ میں رہنے کے دوران بابا نے محبت اور پیار کے اشلوک کہے جن کی بنیاد روحانی ترقی سے تھی۔

طبقاتی تقسیم کو فطرت قبول نہیں کرتی۔ سرحدوں کا تعین اور انسانی امتیازات سیاسی بندربانٹ تو ہو سکتی ہے لیکن صوفی کے سکول آف تھاٹ میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہریانہ اور پنجاب کی دھرتی سنتوں، ہری جنوں، صوفیاؤں کی زمین ہے۔ یہاں کی فضائیں آج بھی اُنہی عظیم سنتوں کے پوتر اشلوکوں سے گونج رہی ہیں۔ اس سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ ہزاروں حکمران اس زمین سے جاہ وجلال دکھا کر چلے گئے۔ کئی بے نام ہو گئے لیکن صوفیاء کرام، سنتوں اور بھگتوں کے نام آج بھی زندہ ہے۔

بابا فرید بھگت کبیر نے شاہ حسین، وارث شاہ، بابا گورونانک اور گاندھی جی آج بھی دلوں میں زندہ ہیں۔

اللہ کے آخری نبی کا پیغام بھی محبت، امن اور دینی دنیاوی ترقی کا ہے۔ آپ طبقاتی کشمکش کے خلاف تھے۔ اسلام ذات پات کی تفریق سے مبرا مذہب ہے۔ بابا فریدؒ

برہمن وشودر کے امتیاز کے قائل نہیں بلکہ بتانِ رنگ وخون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جانے کی تبلیغ کرتے تھے۔ بابا فرید کے ہاں نفس کی خواہشات کی نفی اور کردار کی بہتری پر زور دیا گیا ہے۔ مذہب، روح کی پاکیزگی اور عبودیت کے اظہار کا نام ہے جبکہ حقوق العباد اور سماج کی بہتری کا تعلق انسانی کردار کے مثبت رویہ کا نام ہے۔

آج کا دور مادیت پرستی، سائنسی توجیحات اور زندگی کی تیز رفتاری کا نام ہے۔ مفادات کی جنگ میں انسانی جذبات کے تقدس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مذہب کے نام پر سادہ لوح انسانوں کو نفسیاتی انحطاط کا شکار کر کے دنیا میں رموزِ زندگی گزارنے کی اصل روح سے دور لے جانے کی سعی کی گئی ہے۔ انتہا پسندی کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ ایسے پُر آشوب دور میں بابا فرید کی شاعری ہمیں طمانیت سے لبریز کرتی ہے۔ ان کی شاعری انسان کو تحمل اور نظم وضبط کا درس دیتی ہے۔ بابا جو ظاہر اور باطن کا بیک وقت صاف ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

بابا فرید کی شاعری نے ہر شخص کو متاثر کیا۔ اس تاثر میں مذہب عقیدہ اور مزاج بھی رکاوٹ نہیں بن سکے۔

سچے تیری آس

باباجی فریدؒ کو اُن کے کسی چاہنے والے نے تحفہ کے طور پر ایک قینچی لا کر دی۔
باباجی نے قینچی لینے سے انکار کیا اور مسکراتے ہوئے اُس کو کہا کہ میں تو سینے والوں میں ہوں۔ بھائی مجھے قینچی کی بجائے سوئی دھاگہ پسند ہے۔ بات قینچی اور سوئی کی نہیں، بات اُس فکر کی ہے جس کو اگر آپ پیار، محبت اور اچھائی کی جانب موڑ دیں تو آپ وَلی اللہ بن جاتے ہیں اور اگر اُس کو آپ نفرت اور برائی کی طرف موڑ دیں تو آپ عدواللہ بن جاتے ہیں۔ اللہ سے دوستی کیا ہے؟ باباجی فرماتے ہیں:

مَت ہوندے ہوئے ایانا، تان ہوندے ہوئے نتانا
اَن ہوندے آپ ونڈائے، کوءِ ایسا بھگت سدائے

اللہ کا ولی یا دوست کون؟ باباجی نے اس اَشلوک میں اس کی درجہ ذیل تین خوبیاں بیان کی ہیں۔
پہلی خوبی: بندے میں مَت، سوجھ بوجھ یا بدھی ہے، علم وفکر سے آگاہی ہے، عقل کا استعمال جانتا ہے، مگر وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا کہ وہ عالم فاضل ہے۔ بلکہ بچے کی طرح وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھنے کو تیار رہتا ہے۔

دوسری خوبی: بندے میں طاق تہے، عہدہ ہے، پاور ہے، مگر اپنی پاور کو وہ آف رکھتے ہوئے محض اپنی حیثیت کو عاجزی اور عابدی پر ہی مرکوز رکھتا ہے۔ عبد کو اِس بات کی خبر ہے کہ رَبّ کی ذات اور اُس کی طاقت کے آگے اُس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ بقول میاں محمد بخشؒ:

عدل کریں تاں تھر تھر کمبن، اُچیاں شاناں والے

شیکسپیئر نے وِینس کے مرچنٹ میں کیا خوب کہا ہے:

"God's mercy alone can save us. If he just we'll be doomed"

خدا کے عدل و حکم کے آگے، کس کی مجال ہے جو انکار کر سکے۔ عافیت و خیریت اُس ذاتِ حق کے آگے عاجزی سے سر جھکانے میں ہے۔ یہاں سلسلۂ چشتی کے ایک عظیم ولی حضرت خواجہ غلام فریدؒ جن کے نام کے معنی "بابا جی فریدؒ کا غلام" کے ہیں ارشاد فرماتے ہیں:

زیر تھی، زَبر نہ تھی
متاں پیش پوی

زیر زبر اور پیش کو انہوں نے کمال مہارت سے استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ بچت زیر رہنے میں ہے، زبر بننے میں نہیں۔ زبر بننے سے خدشہ ہے کہ کہیں پیش نہ پڑ جائے۔ پنجابی کے ایک بہت ہی بڑے شاعر میاں محمد بخشؒ جن کا تعلق میرپور، کشمیر سے ہے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "سیف الملوک"، جس کا اصلی نام "سفر العشق" ہے میں فرماتے ہیں:

اُچا ناں رکھایا جس نے، چُلھے دے وِچ سڑیا
نیواں ہو کے لنگھ محمدؒ، لنگھ جائیں گا اڑیا

لفظ "اُچا" کے دو معنی ہیں، اونچا کے ایک معنی اونچے لوگوں سے مراد ہے یعنی شملے والوں یا بڑے بڑے عہدے رکھنے والوں کو اُچا کہا گیا ہے اور دوسرا یہ لفظ پنجابی میں چمٹے یعنی (pincer) کے متبادل کے طور پر بھی بولا جاتا ہے۔ میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں کہ جس نے بھی اپنا نام اُچا رکھایا اس کو آگ میں سڑنا پڑے گا۔ اس آگ سے مراد دوزخ کی آگ بھی ہوسکتی ہے۔ تکبر کرنے والے کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ جبکہ عاجزی اور انکساری رکھنے والے کو اس ذات کے حضور کامیابی و کامرانی نصیب ہو گی۔

بابا جی فریدؒ کا ہی ایک اور اشلوک کمال کا ہے۔ فرماتے ہیں:

فریدا! میں نوں منج کر، نکّی کر کے کُٹ

بھرے خزانے رَبّ دے، جو بھاوے سو لُٹ

اس اشلوک میں بابا جی فرید فرماتے ہیں کہ اے فرید "میں" کو کوٹ کوٹ کر مونج کی طرح باریک کر، تاکہ اُس کا ایک ایک ریشہ الگ ہو سکے اور جس کو بعد میں مروڑے دے کر رسّی بنائی جا سکے۔ (موُنج کی رسّی سے چارپائیاں بُنی جاتی ہیں)۔ باباجیؒ نے تکبر، غرور اور ہنکار کا علاج اس "میں" کو پھینٹی چاڑھنے سے کیا ہے، اور اس کو اگر قابو کر لیا جائے تو رَبّ کی رحمت کے خزانوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ اور بندہ اطمینانِ قلب کی اس حالت کو پہنچتا ہے، جہاں وہ ہر حال میں خوش اور راضی بارضا رہتا ہے۔ دُکھ آئے تو چیخ و پکار نہیں کرتا اور سُکھ آئے تو بھنگڑے نہیں ڈالتا۔ بس اُس کی ذات میں الست مست رہ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ بندے کا ایک بڑا پرابلم ہے کہ وہ اپنے وجود سے، اور وجودی اشیاء میں گُم ہو جاتا ہے۔ روح بیچاری تڑپتی رہتی ہے اور پھر اس دنیا کی بھول بھلیوں میں انسان اس قدر کھو جاتا ہے کہ روح بالآخر بے روح ہو کر رہ جاتی ہے۔ اولیاء اللہ کا سب سے پہلا اور آخری عمل روح کو زندہ رکھنا ہے۔ روح کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو دنیاوی الائشوں سے پاک رکھنا پڑتا ہے۔ اس عارضی ٹھکانے سے دل لگانے والے لوگ اللہ والوں کو اس صفتِ خصوصیہ سے آگاہی حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ دنیا کو صوفیائے کرام نے زن حیض پلیتی جسم کھانی اور ڈائن کے ناموں سے تشبیہہ کیا ہے۔ دنیا والوں کو زبانیں باہر لٹکائے ہوئے کنالی چاٹتے کتوں سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں، ایک مسیت میں دو مُلاں نہیں رہ سکتے بلکہ اسی طرح ایک دل میں روحانیت اور دنیا اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ایک کو تو طلاق دینا ہی پڑے گی۔ روح والے دنیا کی تباہ کاری سے آگاہ ہوتے ہیں جبکہ دنیا والے کم عقل روح والوں کی خصوصیات سے نابلد ہوتے ہیں۔ بابا جی فرید کے ہی درجہ ذیل کچھ اشلوک جن میں انہوں نے اس فرق کو کیا خوب واضح کیا ہے۔

دنیاداروں کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں:

فریدا کنھ مُصلّا، صوف گل، دل کاتی، گڑ وات

باہر دِسّے چانَنا، دل اندھیاری رات

اس اشلوک میں باباجی نے مذہب کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنانے والوں کا حلیہ اور کسب بیان کیا ہے کہ یہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔ باباجی بُلھے شاہ نے بھی اِسی اشلوک کو ایک اور طرح سے بیان کیا ہے کہ:

مُلاں تے مشالچی، دووِیں اِکو چت

لوکاں کردے چانَنا، آپ ہنیرے رَت

اس شعر کا مختصر ترین مطلب چراغ تلے اندھیرا کے ہیں۔

باباجی فرید نے درجہ ذیل اشلوک میں روحانیت کو موتی اور دنیا کو چھپڑ سے تشبیہہ دی ہے، فرماتے ہیں:

فریدا سوءِ ی سرودَر ڈھونڈ لے، جِتھے لبھے وَتھ

چھپڑ ڈھونڈیں کیا ہوئے، چکڑ ڈُبے ہتھ

اِس دنیا کو باباجی نے چھپڑ یعنی بدبودار تالاب سے تشبیہہ دی ہے۔ درجہ ذیل دواور کمال کے اشلوک ملاحظہ فرمائیں:

کلر کیری چھپڑی، آ اُلتھے ہنجھ

چنجو بوڑن، نہ پیون، اُڈن سندی ڈنجھ

اللہ والے اِس چھپڑی پر آئے ہیں مگر اِس سے ان کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ جس طرح ہنس موتیوں کی چوگ چگتا ہے اور پاک صاف اشیاء پر گذر اوقات کرتا ہے اِسی طرح اولیاءاللہ بھی اِس دنیا سے اکتائے ہوئے ہر وقت اڑنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن کے دل میں اس مایا اور لوبھ بھری دنیا سے نفرت ہوتی ہے۔ باباجی فریدؒ ہی کا یہ شعر بھی اُن کے اس طرح کے خیالات کا تسلسل ہے۔ فرماتے ہیں:

ہنس اُڈر کودھرے پئیا، لوک وِڈارن جائے

گیہلا لوک نہ جاندا، ہنس نہ کودھرا کھائے

ہنس اُڑتا ہوا آیا اور کودھرے کے کھیت میں آ بیٹھا۔ لوگ اُڑانے کے لئے گئے۔

مورکھ لوگ نہیں جانتے کہ ہنس کودھرا نہیں کھاتا۔ ہنس سے مراد یہاں اللہ والوں کی ہے جو

اِس دنیا سے دل نہیں لگاتے۔ بلکہ وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹا سب بیوپار ہے۔ جیسا کہ مادھولال شاہ حسین نے اس دنیا کے بارے میں فرمایا ہے۔ کہ:

ایہہ دُنیا دِن دو اے پیارے، ہر دَم نال سمھال
کہے حسین فقیر سائیں دا، جھوٹا سب بیوپار

باباجی اللہ کی آس پر بھروسہ کیے دنیاوی چاشنیوں سے دور بھاگنے کی ترغیب دیتے ہیں:

سرووَر پنکھی ہیکڑو، پھاہی وال پچاس
ایہہ تَن لہریں گڑ تھیا، ہیچ تیری آس

بابا فریدؒ کی عوام دوستی

یہ سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ زمین پر نیکی اور بدی کی قوتیں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں برسرِ پیکار رہی ہیں۔ زمین پر بدی، برائی اور ظلم کی قوتوں کے سامنے نیکی جن قوتوں نے آنے کی ہمت کی اور اپنے محاذ پر کامیاب و کامران ٹھہرے، ان میں صوفیا کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ بابا فریدؒ انہی صوفیا کے سلسلے کی ایک ایسی روشن کڑی کا نام ہے جس کی روشنی کا دائرہ وقت کے ساتھ پھیلتا اور زمین کے دور دراز کے حصوں کو روشن کرتا جا رہا ہے۔ بابا فرید کی ذات، حیات اور تخلیقی کارناموں پر ایک مدت تک حالات کی گرد پڑی رہی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ستارے ان گنت اندھیری دنیاؤں کے بیچ میں سے سامنے آ جاتے ہیں، سو وقت کے ساتھ ساتھ پنجاب کا مان بڑھانے والے اور ہماری مٹی کو دنیا بھر معتبر بنانے والے بابا فرید بھی اپنے پورے جمال اور خیال کے ساتھ اسی طرح ہماری رہنمائی کے لئے سامنے آ رہے ہیں جس طرح وہ گیارہویں صدی عیسوی میں اس وقت سامنے آئے تھے جب چنگیز خان اور ان کے وارثوں کے وسطی ایشیا سے پنجاب تک کے ظلم و ستم اور سروں کے مینار بنانے انداز زندگی سے عام آدمی پر خوف و دہشت کی کیفیت طاری تھا۔

بابا فرید جیسی شخصیات صدیوں کے بعد عالم ظہور میں آیا کرتی ہیں۔ بابا فرید کی ذات کے کئی رنگ ہیں۔ کبھی وہ مذہبی پیشوا کی حیثیت سے رواداری، محبت، فلاح اور اصلاح کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں، کبھی انسانیت کے علمبردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری کو سامنے رکھا جائے تو دل میں اتر جانے والے ان کے بول خاص و عام کو اپنا گرویدہ کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ایک عہدِ تاریک میں پنجابی زبان کے محافظ بھی قرار پاتے ہیں اور عوامی کلچر کو اوڑھنا بچھونا بنا کر ان کی ذات ایک پوری پنجابی تہذیب کی امین دکھائی دیتی ہے اور ان کی سوچ پنجابی تہذیب و تمدن کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی محسوس ہوتی ہے۔ گویا وہ مذہبی، ثقافتی، ادبی اور معاشرتی غرض تمام محاذوں پر عوام کی قیادت کرتے نظر آتے ہیں۔

پنجاب کے دکھ درد کے مارے ہوئے عوام کو چنگیزی یلغار سے نجات دلانے اور ایک نئے انداز سے جیون سے پیار کرنے پر مائل کرنے والے بابا فریدؒ کے اسی لطف و کرم کا اعتراف سید وارث شاہؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

مودود دا لاڈلا پیر چشتی شکر گنج مسعود بھرپور ہے جی
خاندان وچ چشت دے کاملیت، شہر فقر دا پٹن معمور ہے جی
بائیاں قطباں دے وچ ہے پیر کامل، جیں دی عاجزی زہد منظور ہے جی
شکر گنج نے آن مکان کیتا، دکھ درد پنجاب دا دور ہے جی

ہم ایک طرف عام مسلمانوں کے دلوں کو محبت کے راستے پر لانے والے قافلے کے ایک بڑے تاجدار نظام الدین اولیاءؒ کو بابا فرید کے دستِ شفقت پر بیعت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ایک وقفے کے بعد پنجاب میں نسلی برتری کی سوچ سے لہولہان معاشرے میں سلامتی محبت اور انسان دوستی کے علمبردار بابا گرونانک جی کو بابا فرید جیسے بزرگوں کے افکار کے گلاب چنتے دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ بابا فرید کی ذات کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ الگ گفتگو کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہاں میں ان کی عوام دوستی کے پہلو کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

درویش خدامست اور صوفی کی حیثیت سے سامنے آنے والوں کے بارے میں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تارک الدنیا ہو کر دوسروں کو بھی دنیا اور اس کی جملہ مصروفیات کو ترک کر دینے کی دعوت دیتے رہتے ہیں اور بابا فرید جس زمانے میں (1188ء تا 1280ء) رہے وہ تو خاص طور پر ایسا دور تھا جب چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے راجے اور بادشاہ درحقیقت رات دن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، اپنے فرمان کو قانون کی حیثیت سے منوانے اور انکار کرنے والوں کو ہر طرح کے رحم، انصاف اور اصول سے بالاتر ہو کر تہس نہس کر دینے میں مصروف رہتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر کھال کھنچوا دینا، سرتن سے جدا کر دینا، زندان میں ڈال دینا، آنکھ، کان، زبان سے محروم کر دینا معمول تھا۔ عوام اس ساری کشمکش کا اصل نشانہ بنے رہتے تھے اور ایک طرف سے دوسری طرف جاتی سپاہ، ہنہناتے گھوڑوں اور بھوکی آنکھوں کی خوراک بنے رہتے تھے۔ محنت سے اگائی گئی فصلوں اور بچائی گئی عزتوں کو آن کی آن میں فنا ہوتے دیکھنا ہی عوام کا مقدر تھا۔ ایسے میں بابا فرید میدان میں اترے اور اللہ کا نام لے کر انہوں نے ایک نئے انداز سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا۔

یہ عوام کی طرف سے پہلی آواز تھی جو اپنے دور کی ہر طرح کی جنگی ہوس، فتح کی خواہش اور لوٹ مار کے فلسفے کے برعکس تھی اور یہ آواز ایک ایسے شخص کی طرف سے بلند ہو رہی تھی جس کا خاندان (ایک حوالے سے) شاہی نسبت بھی رکھتا تھا لیکن جس کی اصل قوت ان کا اپنا کردار تھا۔ شمال کے پہاڑوں سے چنگیزی قافلے جب اردگرد مار کرتے، انسانی سروں کے مینار بناتے، میدانی علاقوں کی طرف اترتے اور عام لوگوں کی بستیوں میں خاک اڑتی، بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار بلند ہوتی اور پکی فصلیں راکھ کا ڈھیر بنتیں تو پنجاب سے ایک آواز بلند ہوتی۔

فریدا رُت پھری، وَن کَنبیا، پت جھڑیں جھڑ پائیں
چارے کُنڈاں، ڈھونڈیاں، رین کِتھاؤں ناہیں

یعنی اے فرید موسم میں، رت میں تبدیلی آئی ہے تو دن اور دوسرے جنگلی درخت بھی کانپ رہے ہیں۔ اتنی پت جھڑ ہوئی ہے کہ جھڑ جیسا اندھیر ہو گیا ہے۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں تو کوئی جگہ پناہ کے قابل اور رہنے کے قابل نہیں بچی۔

ہر چند بابا فریدؒ کی زندگی میں ہی 1221ء میں چنگیز خود تو آنجہانی ہو گیا مگر وارثوں کا انداز وہی رہا۔ چنانچہ بابا فرید کے دور میں ہی 1241ء میں جب لاہور اُجڑا تو ایک فاصلے پر بیٹھے بابا فرید کا پیغام پورے معاشرے کی سدھار کے لئے دو انداز لئے سامنے آیا۔ ایک طرف تو انہوں نے اس طبقے کو مخاطب کرنا شروع کیا جس کی زندگی عیش وعشرت کی راہ پر چل نکلی تھی اور جو عوام کو اپنی خوشیوں اور اپنے سکھ میں حصہ دار بنانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس عیش وعشرت والے طبقے کو باباجی نے بار بار جھنجھوڑا اور کہا:

روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ
جنہاں کھاہدی چوپڑی گھنے سہن گے دُکھ

دوسری طرف بابا فرید نے عوام کے کندھے پر ہاتھ رکھا، انہیں حوصلہ دیا، انہیں ظلم کے خلاف آواز بلدن کرنے کی ترغیب دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہیں ذہنی طور پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ وہ اپنی زندگی، اپنے کرادر کو بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کریں۔ اپنی جان، مال اور عزت کی حفاظت کے لئے جاگتے رہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

کوک فریدا کوک توں جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار

حضرت بابا فریدؒ کی زندگی اور کلام کا ایک خاص رخ عاجزی میں عظمت کے احساس کو فروغ دینا ہے۔ ان کا ایک شلوک ہے:

صاحب دی کر چاکری دِل دی لاہ بھراند
درویشاں نوں لوڑیئے رُکھاں دی جیراند

بابا فرید کے پیغام میں اہم ترین نکتہ عام آدمی کی زندگی کو اچھے طریقے سے گزرانے کا احساس ہے جو گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں صدی کے آغاز میں دو سطحوں پر ختم ہو رہا تھا۔ ایک سطح پر تو دنیاوی اقتدار کے لئے ہر زیادتی اور ظلم روا رکھا جاتا تھا اور دوسری طرف مارے جانے کے خوف نے زندگی کی اہمیت ختم کر دی تھی۔ بابا فرید نے عام لوکائی کو زندگی اور وقت کی قدر کرنے اور اپنے خالق سے لو لگا کر باہمی محبت اور پیار سے ایک انصاف پر مبنی معاشرے کو تشکیل دینے کی دعوت دی۔

اس مقصد کے لئے ان کے کلام میں تمثیلات کا ایک انوکھا جہان موجود ہے، چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

چار گنوائیاں ہنڈھ کے، چار گنوائیاں سم
لیکھا رب منگیسیا، توں آیو کیڑے کم

یعنی دن رات کے آٹھ پہروں میں سے چار پہر تو نے بے مقصد چل پھر کے ضائع کر دیئے اور چار پہر سُو سُو کر گزار دیئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے زندگی کا حساب مانگا کہ تجھے دنیا میں کس کام کے لئے بھیجا تھا تو کیا جواب دے گا؟

فریدا راتیں وَڈیاں دُھکھ دُھکھ اٹھن پاس
دِھرگ تنہاں دا جیویا، جنہاں وِڈانی آس

یعنی اے فرید زندگی کی راتیں طویل اور لمبی ہیں جن میں ایک پہلو جلنے لگتا ہے تو کروٹ بدل کر دوسرے پہلو لیٹ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایسے حالات میں ان لوگوں کو زندگی پر افسوس ہوتا ہے جو اپنے اوپر انحصار کرنے کے بجائے دوسروں سے آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور عمر ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

فریدا بُرے دا بھلا ر، غصہ من نہ ہنڈھا
دیہ روگ نہ لگ ای پلے سب کچھ پا

اے فرید اگر کوئی برائی کرے تو بھی اس کا جواب بھلائی سے دے۔ کسی کی برائی کا غصہ نہ کر۔ اگر تو اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرلے گا تو تیرے جسم پر کوئی بیماری اثر نہیں کرے گی۔ اس بات کو اپنے پلے باندھ لے اور ہمیشہ یاد رکھ۔

میں جانیا دکھ مجھی کو دُکھ سبھائے جگ
اُچے چڑھ کے وِیکھیا تاں گھر گھر ایہا اگ

20ویں صدی میں ہم بہت سے انقلابیوں کا تذکرہ پڑھتے ہیں کہ انہوں نے استحصالی معاشرے کے خلاف آواز بلند کی ہے، عوام کو زبان دی ہے لیکن یہ سب کچھ ایسے معاشرے میں تو آسان ہے جہاں قوانین ہیں۔ میڈیا کے ذریعے بہت کچھ ممکن ہے۔ حکومتیں کششِ ثقل کے کائناتی نظام کی طرح ایک ڈھانچے کی پابند ہو رہی ہیں لیکن تقریباً

ایک ہزار سال پہلے جب آدابِ شاہی فرانِ شاہی سے زیادہ مؤثر تھے اور عوام سب کچھ بلا چوں و چراں پیش کر دینے یا خوفناک موت کے لئے تیار رہنے کے سوا کچھ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ایک بندہ خدا کا اس طرح پکار کرتا اور سرِ عام کہتا کہ

اِکنا آٹا اَگلا، اِکنا ناہیں لون
اَگے گئے سنجاپسن، چوٹاں کھاسی کون

یہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ بابا فریدؒ نے ایسے شلوک بیان کر کے اگر ایک طرف عوام کے جذبات کی ترجمانی کی، انکے دکھ درد کو بیان کیا اور ان کے اندر طبقاتی جدوجہد کی آگ بھڑکائی تو دوسری طرف دورِ حاضر کے انقلابیوں کی طرح انہیں بے لگام نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے جذبات کے آگے بند بھی باندھا اور انہیں صبر اور تحمل کی تلقین بھی کی اور کہا

رُکھی سُکھی کھائیکے، ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسانویں جی

اس طرح دراصل بابا فریدؒ عوام میں خودداری اور عزتِ نفس کے جذبے کو تقویت دیتے رہے۔ وہ سکھ خیال کی ایسی چھتری تھے جس کے نیچے آ کر سانس لینے والے خود کو انسان سمجھنا شروع کر دیتے تھے۔ آنے والوں میں ہر دھرم اور ہر رنگ روپ کے لوگ ہوتے تھے جو ہوا کے جھونکوں کی طرح بابا فرید کے دامن کو سلام کرتے ہوئے گزرنے والے دریا کی لہروں کی طرح "اک مک" ہو کر اپنے من اور تن کی پیاس بجھاتے تھے۔ اپنی محفلوں میں بابا فرید نے من و تو کی تفریق ختم کر دی تھی۔ امیر اور غریب ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا اور دل سے دل ملا کر بیٹھتے تھے اور وہ اپنی مٹی سے پیار کا درس کچھ یوں دیتے ہیں کہ

فریدا خاک نہ نندیے خوکوں جیڈ نہ کو
جیندیاں پیراں تھلے، مویاں اوپر ہو

تو ان کے چہروں پر لہو کی سرخی نمایاں ہونے لگتی تھی۔ بابا فریدؒ موت کو یاد کرنے کی تلقین اسلئے کرتے تھے کہ زندگی کے محدود لمحوں کو ضائع نہ کیا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ وہ ہر لمحہ اس کی نسبت کی قدر کرتے ہوئے ہوشیار رہ کر کچھ کرنے کے علمبردار تھے۔

اُٹھ فریدا سُتیا، جھاڑو دے مسیت
تو سُتا رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

آپ کا فرمان تھا کہ وقت کے برابر کوئی شے نہیں ہے، اپنی خامیوں کے نکتہ چین خود بنو، وہ شخص بھی مردہ ہے جو جاہل ہے۔ علم حاصل کرو مگر انکساری کے ساتھ اور عظمت اس میں ہے کہ مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کے افراتفری کے دور میں ایسی باتیں وہی شخصیت کرسکتی ہے جسے قرسم بی بی جیسی عظیم شب بیدار والدہ محترمہ کی گود اور ابتدائی تربیت ملی ہو۔ جناب جمال الدین سلیمان جیسے سراپا شفقت اور نیک سیرت والد کا سایہ نصیب ہوا ہو، مولانا منہاج الدین جیسے جید اساتذہ سے قرآن پاک اور فقہ کی تعلیم حاصل کی ہو اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جیسے مرشد کامل کی نگاہ گوہر شناس ملی ہو۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ بابا فرید روشنی کے ایک کائناتی سلسلے کا حصہ ہیں جس کے بہاؤ میں اوپر کی جانب ہمیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی زیارت ہوتی ہے تو بہاؤ کے دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاءؒ بابا گورونانک اور آگے بابا کبیر، شاہ حسینؒ، بلھے شاہؒ اور ایسے ہی انگنت روحانی ستارے چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

بابا گورونانک کا یہاں میں خاص طور پر تذکرہ کرنا چاہوں گا کیونکہ انہی باکمال بابا نے ہمیں بابا فریدؒ سے ملوایا ہے۔ بابا فرید کے کلام کا بڑا حصہ وہی ہے جو گرنتھ صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ بابا فرید کے کلام کو زندہ کلام اس لئے تسلیم کیا جاتا ہے کہ بابا فرید کے وصال کے دوسو سال بعد بابا نانک جیسی حق پرست ہستی جب پاکپتن تشریف لاتی تو بابا فرید کے کلام کو اپنے انتخابِ محبت کا حصہ بناتی ہے۔ میں بابا گورونانک جی کے ساتھ ساتھ حق شناس گورو ارجن جی اور بھائی گورو داس جی کو خصوصی طور پر خراج پیش کروں گا کہ انہوں نے بابا فرید کے وصال کے تقریباً 339 برس بعد جب گرنتھ صاحب کو اصل شکل میں لانے کا کام کیا تو بابا فریدؒ کے کلام کے سلسلے میں بھی خصوصی احتیاط سے کام لیا اور یوں دانش وحکمت اور روحانی تہذیب کے ایک اہم ترین پنجابی ذخیرے کو محفوظ کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جو شمال اور مغرب سے سیاسی اقتدار کے لئے مسلسل یلغیار کرنے والے بڑے بڑے صاحبانِ جاہ وجلال مسلمانوں سے نہ ہوسکا۔ آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کو

جو سب کے بزرگ ہیں، بکمال محبت سے اپنی روحانی قیادت کا مقام دے کر پنجابی ایکتا کی ایسی بنیاد رکھ دی کہ بعد میں بھائیوں کی آپس میں تلخیوں کے باوجود ایک دوسرے کے لئے تہذیبی محبت کے سرچشمے کبھی خشک نہیں ہوئے۔ اب ہم اور آپ دو آزاد ریاستوں (مشرقی اور مغربی پنجاب) کے شہری ہیں اور یہ جغرافیائی صداقت ہے مگر بابا فریدؒ اور بابا گرونانک اور ان کے بعد جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت نظام الدین اولیاء سرکار، گوروارجن جی اور بھائی گورداس جی کے دور کی ہماری تہذیبی فریکونسی کی شناخت ایک جیسی نظر آتی ہے اور جب ہم اس فریکونسی پر آکر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو بابا فرید کا یہ شبد زبان پر آجاتا ہے۔

دلوں محبت جیں سی اوہی سچے آ
جیں من ہور، مکھ ہور سے کاندھے کچے آ

جن کے دلوں میں محبت ہے وہی سچے لوگ ہیں، جن لوگوں کے دل اور ہیں اور ان کے چہرے اور ہیں وہی لوگ کچے ہیں۔ دعا ہے کہ ہم سچے بنے رہیں کچے نہ بنیں۔

بابا فریدؒ گنج شکر کی فکری اور شعری تعلیمات

پنجاب میں چشتیہ تعلیمات کی تجسیم بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی صورت میں ہوئی۔ ان کی ذہنی رویے کی نشاندہی علامتی انداز میں اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب ایک عقیدت مند نے بابا فریدؒ کو ایک قینچی پیش کرنا چاہی تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے قینچی نہ دو کہ میں کاٹنے والا نہیں ہوں۔ مجھے سوئی دو کہ میں جوڑنے والا ہوں۔ بابا فریدؒ کا ترکیبی رویہ اس حد تک وسیع تھا کہ انہوں نے ریاضت کے بہت سے ہندووانہ طریقے اعلانیہ اختیار کر لئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا سلسلہ ہند کے وسیع و عریض علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ ہزاروں لاکھوں افراد اس سے باقاعدہ طور پر وابستہ تھے۔ اس کی اہمیت محض روحانی نہیں رہی تھی بلکہ عوام کی بے پناہ عقیدت کی بنا پر اسے روز بروز سیاسی اہمیت بھی حاصل ہونے لگی تھی۔ یہاں تک کہ سلاطین دہلی اسے اپنے تخت وتاج کے لئے خطرہ تصور کرنے لگے تھے۔ اقتدار سے بیزاری اور سادگی بابا فریدؒ کی شخصیت میں بہت تھی۔ اس لئے انہوں نے کوشش کی کہ تصادم شدید نہ ہو۔ وہ ریاستی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ حکمرانوں سے دور رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور مریدوں کو بھی دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ یہاں تک

کہ انہوں نے دار السلطنت سے دور رہنے کو ترجیح دی۔ دہلی کو تیاگ دیا اور پنجاب میں اجودھن پنجاب کا سب سے بڑا ثقافتی، علمی اور روحانی مرکز بن گیا، یہاں ہندو مسلم ثقافتوں کے ملاپ سے ایک نئی اسلامی ثقافت پروان چڑھنے لگی۔ بابا فرید کی بنا پر تصوف پنجاب میں ایک عوامی تحریک بن گیا۔ روحانی نجات کی جستجو میں لوگ جوق در جوق دور دراز سے اجودھن کا رخ کرنے لگے۔ روحانیت کا چرچا ہونے لگا، تعصبات مٹنے لگے، شاعری اور موسیقی رواج پانے لگی اور خود بابا فرید نے اسی زبان میں شاعری کی۔

ان کا تعلق عوام سے تھا۔ ان کے مفادات عوام سے وابستہ تھے۔ وہ عوامی ثقافت کے محافظ تھے۔ طبقاتی نظام اور اونچ اونچ کے مخالف تھے۔ سادگی پسند تھے۔ مساوات کے قائل تھے، انسان دوستی کا درس دیتے تھے۔ حاکم ومحکوم کی تقسیم ختم کرنا چاہتے تھے۔ سب کے لئے یکساں انصاف کے طالب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن بدن حکمران طبقوں سے کٹ کر عوام کے ساتھ گھل مل گئے۔

بھگتی تحریک اصل میں چشتیہ مکتبہ فکری ہی کی ایک ترقی یافتہ اور ہندو پس منظر میں پیش کی جانے والی تحریک تھی۔ پنجاب میں اسے فروغ بابا گورونانک کی جدوجہد سے ملا۔ اس دانشور گورو نے بھگت کبیر کے گہرے اثرات قبول کئے تھے۔ یہاں تک کہ گوروگوبند سنگھ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ بھگت کبیر کا مذہب اب خالصہ ہو گیا ہے۔ صوفیوں اور بھگتوں کی طرح بابا گورونانک نے بھی مذہب کی ظاہری صورتوں اور عبادتوں پر اُس کی روح کو ترجیح دینے کا درس دیا۔ کہ حقیقی مذہبی زندگی، باطن پاکیزگی سے عبارت ہے، صداقت ایک ہے جو ظواہر کی لامحدود سطحوں کے پس پردہ کارفرما ہے۔ ہندومت اور اسلام اسی ایک صداقت کے دو مظاہر ہیں۔ جب تک طبقات موجود ہیں یکساں اور عالمگیر محبت کے آدرش شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

پنجاب میں سید علی ہجویری کے بعد جس صوفی بزرگ نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا وہ بابا فریدالدین مسعود گنج شکر ہیں ان کا تعلق تصوف کے چشتی مکتبہ فکر سے تھا۔ تصوف کی چشتیہ روائت کا آغاز دسویں عیسویں میں اس وقت ہوا جب سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران اس روائت کے علمبردار بہت سے بزرگوں نے پنجاب کا رخ کیا اور

یہیں آباد ہو گئے۔ بابا فریدؒ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے بعد ہند میں اس روحانی سلسلے کے رہنما مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے مروجہ ظاہری علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اس کے بعد انہوں نے دہلی کا قصد کیا اور اپنے مرشد کی نگرانی میں روحانی تربیت کا آغاز کیا اور دہلی پہنچنے کے بعد انہوں نے شدید ریاضت اور مجاہدے شروع کئے۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر چلۂ معکوس (چالیس دن تک کنوئیں میں الٹے لٹکے رہنا) کا ذکر کیا جاتا ہے، اس کے بعد انہوں نے اپنے مرشد کی اجازت سے ہانسی میں رہائش اختیار کی۔ اسی دوران مرشد کا انتقال ہو گیا۔ اور انہیں چشتیہ سلسلے کا سربراہ بنا دیا گیا اور انہوں نے پنجاب میں واقع اجودھن نامی قصبے کو اپنا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی ان کی شہرت ہونے لگی اور لوگ جوق در جوق ان کی جانب رجوع کرنے لگے۔ بابا فرید نے یہاں صوفیانہ روائت کے مطابق ایک جماعت خانے کی بنیاد رکھی۔ اجودھن کی خانقاہ میں ایک صوفیانہ درس گاہ کی تمام جملہ خصوصیات موجود تھیں۔ جماعت خانے میں بہت سے دانشور اور صوفی ہر وقت موجود رہتے۔ بابا فریدؒ کی شاعری ہم تک آدگرنتھ کے شلوکوں کے ذریعے پہنچی ہے۔

بابا فریدؒ کی تعلیمات بنیادی طور پر وہی ہیں جو ان سے دو صدیاں پہلے سید علی ہجویری متعارف کرا چکے تھے۔ اس اعتبار سے بابا فرید کی تعلیمات کو پنجاب کی زریں روائت کا تسلسل تصور کرنا چاہئے۔ ان کے ہاں بھی مذہبی قانون اور داخلی صوفیانہ صداقت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ بابا فریدؒ کی بنا پر تصوف پنجاب میں ایک عوامی تحریک بن گیا تھا۔ بابا فرید کے خیال میں تصوف اور گوشہ نشینی ہم معنی قرار پاتے ہیں۔ جہاں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن صفات سے خارج نہ ہو۔ وہیں وہ اس امر کو بھی واضح کر دیتے ہیں کہ صوفی کے لئے دنیا کی آسائشوں اور بشریت کی گندگی سے محفوظ رہنا بھی ناگزیر ہے۔ ان کے نزدیک جب تک کوئی شخص اپنے باطن کو دنیا کے تمام معاملات سے پاک نہیں کر لیتا اسے واجب نہیں کہ خرقہ پہنے، خرقہ انبیاء اور اولیاء کا لباس ہے۔

اپنے مخصوص نقطہ نظر کے لحاظ سے بابا فریدؒ نے انسانوں کو تین درجوں میں تقسیم

کیا ہے۔ پہلی قسم میں مکمل طور پر دنیا دار لوگ ہیں۔ دنیاوی جاہ و جلال اور مال و دولت کے لئے تگ و دو اُن کا شیوہ ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو دنیا سے عداوت رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کا ذکر حرص، رنجش اور خصوصیت کے بغیر نہیں کرتے۔ تیسرے وہ ہیں جو قطعی طور پر دنیا سے بے نیاز ہیں، وہ اسے دوست ہی رکھتے ہیں اور نہ ہی اسے دشمن سمجھتے ہیں۔ بابا فرید کے نزدیک یہ آخری گروہ پہلے دونوں گروہوں سے بہتر ہے۔ نظری سطح پر رہبانیت کا پرچار کرنے کے باوجود عملی طور پر بابا فرید انسانوں سے دور نہیں تھے بلکہ ان کے ہاں گوشہ نشینی کا وہ تصور نہیں ملتا جو انسانوں کو اپنے ہی ہم جنسوں سے بیزار کر دیتا ہے۔ بابا فرید کے نزدیک اعلیٰ ترین خیر روحانی پاکیزگی کا حصول ہے۔ دل کی اصلاح کے بغیر روحانی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔

بابا فریدؒ کا نظام فکر مجموعی طور پر اعتدال پسندانہ رجحان کا حامل ہے۔ انہیں نہ تو راسخ العقیدہ لوگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی آزاد خیال گروہ میں۔ وہ ان دونوں کے بین بین رہتے ہیں۔ مذہبی قوانین سے ان کا رشتہ مستحکم رہتا ہے تاہم بہت سے مسائل میں ان کی رسائی عقیدہ پرست دانشوروں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے ہم صحو اور سکر کے صوفیانہ مسئلے کو لے سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے صوفیانہ دانش کے مرکزوں میں اس مسئلے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ عقیدہ پرست دانشور صحو کو سکر پر ترجیح دیتے تھے۔ بابا فرید بھی عام طور پر یہی رائے رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ افشائے حقیت کے باب میں سکر کو صحو پر برتری حاصل ہے۔ شیخ بدارلدین اسحاق نے ان سے یہ جملہ منسوب کیا ہے کہ اے درویش جس طرح کی سخت آگ درویشوں کے سینے میں دبی ہوتی ہے اگر اس میں سے ذرا سی بھی خدانخواستہ سکر کے عالم میں باہر پھوٹ پڑے تو عرش سے فرش تک سب کو جلا کر بھسم کر دے۔ سکر کے بارے میں یہ رویہ فی الواقعہ ایک مکمل نظام فکر کا ناگزیر ضمنی نتیجہ ہے۔ اس نظام فکر میں فنون لطیفہ کے لئے جگہ بہرحال موجود رہتی ہے۔

چنانچہ دیگر چشتی مفکرین کی طرح بابا فریدؒ بھی موسیقی کے شائق تھے۔ عقیدہ پرستوں کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔ انکی نکتہ چینی کے جواب میں بابا فرید نے کہا کہ بڑائی تو

صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے۔ کوئی تو عشق الٰہی کی آگ میں جل کر فنا ہو گیا ہے اور دوسرے جواز اور عدم جواز کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ ان کا نقطہ نظر موسیقی کے ضمن میں اگرچہ سید علی ہجویری سے مشابہہ تھا مگر ان میں اختلاف بھی موجود تھا۔ سید علی ہجویری موسیقی کے حق میں جمالیاتی جواز کو اہم سمجھتے ہیں اور بابا فریدؒ مذہبی دلائل پر انحصار کرتے ہیں۔ موسیقی کے باب میں بابا فرید سے یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ رحمت باری تعالی کا نزول تین مواقع پر ضرور ہوتا ہے۔ ایک تو سماع کے موقع پر دوسرے درویشوں کے احوال بیان کرنے کے موقعے پر اور تیسرا عاشقوں کے انوار تجلی کے عالم میں غرق ہو جانے کا موقعہ ہے۔

پنجابی زبان میں سب سے پہلے جس شاعر کا کلام ہم تک پہنچا وہ حضرت بابا فریدؒ گنج شکر ہی ہیں۔ مگر بابا فریدؒ کے اشلوکوں کی زبان بڑی حد تک منجھی ہوئی اور معیاری ہے، جس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ پہلے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی شعری خصوصیات کی بنا پر ان سے پہلے بھی شعراء یقیناً موجود ہوں گے۔ جن سے انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ صدیوں کے بعد اس معیار تک پہنچی تھی۔ بابا فرید کے بعد شیخ فرید ثانی کا نام شعری حوالوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کے بھی کچھ اشلوک اور کافیاں دستیاب ہیں۔ اسکے علاوہ انہوں نے ایک نصیحت نامہ بھی لکھا۔ گورونانک کا زمانہ ۱۴۶۹ سے ۱۵۳۸ء تک تھا۔ ان کے علاوہ سکھوں کے دوسرے گوروؤں نے بھی پنجابی میں باقاعدہ شاعری کی۔ ان میں گوروانگد جی دوسرے گورورام داس، گروامرداس اور گوروارجن دیو شامل ہیں۔ انہوں نے بھی درویشانہ خیالات کے اشعار کہے۔ اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی پنجابی کے نامور صوفی شاعر شاہ حسین کا زمانہ ہے۔ یہاں ایک بات تعجب کا باعث ہے کہ بابا فرید سے لے کر شاہ حسین تک سوا تین صدیوں کے طویل عرصے میں ہمیں پنجابی شاعری کا سلسلہ منقطع نظر آتا ہے۔ جو ناقابل یقین بات ہے۔ اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس عرصے میں بھی کئی شاعر ہوئے ہوں گے اور انہوں نے یقیناً شاعری کی روائت کو آگے بڑھایا ہوگا۔ مگر وقت کی بے رحمی کے ہاتھوں ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور یا پھر انہیں سند

قبولیت حاصل نہ ہوئی۔ جس کی بنا پر لوگ آج ان کے نام تک سے ناواقف ہیں۔
بہرصورت شاہ حسین کے بعد یہ سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔

بابافریدؒ کی شاعری میں مواد، لفظ، معنی، زبان اور اسلوب کی وہ گہرائی پائی جاتی ہے، جس نے ہر شخص کو متاثر کیا۔ اس تاثر میں مذہب، عقیدہ اور مزاج بھی رکاوٹ نہیں بن سکے۔ یہی کلاسیکی ادب کی سب سے بری خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ادب ہر وقت ہر شخص کے لئے پرکشش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں عالمگیر سچائیوں کی بات کی گئی ہوتی ہے۔ ان کے شلوکوں میں علم بیان، علم بدلیع اور عروض کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس کے علاوہ راگنی کے سرتال بھی جابجا ملتے ہیں۔ جو کہ ان شلوکوں میں گہری تاثیر پیدا کردیتے ہیں۔ موسیقی کی تخلیق میں عروض کے ضابطے، عام شاعری سے کسی حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ کیوں کہ راگنی کا وزن سرتال کی اونچ نیچ کی بنا پر پرکھا جاتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں۔

فریدا روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ
جنہاں کھادی چوپڑی گھنے سہن گے دکھ

علم بیان میں دلالت کے معانی اس طرح ہیں کہ ایک چیز، اس دوسری چیز کا پتہ دے جس کا پہلے پتہ نہیں ہے۔ یعنی ہمارا ذہن اور عقل پہلے بتائی گئی چیز سے معلومات اخذ کرکے دوسری شے تک پہنچ جائیں۔

وہ کہتے ہیں:

فریدا در درویشی گاکھڑی چلاں دنیا بھت
بنھ اٹھائی پوٹلی کتھے ونجاں گھت

بابافریدؒ گنج شکر اپنی شاعری میں تشبیہات کے استعمال میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

جند ووہٹی، مرن ور، لے جاسی پرنائے
آپن ہتھیں جوں کے کیں گل لگے دھائے

ان کی تشبیہات ان کے اپنے علاقے کے گردا گرد ہی سے لی گئی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جن لوگوں کے لئے شاعری کی تھی۔ وہ زیادہ تر ان پڑھ اور جاہل تھے۔ اس لئے

ایسے لوگوں کی تربیت کے لئے تشبیہات کا انتخاب بھی انھوں نے ایسا کیا تھا جو کہ ان کی عقل وفکر سے باہر نہ ہوں۔ کہتے ہیں:

فریدا سوئی سرو ور ڈھونڈ یئے جتھ لبھی وِتھ
چھپڑ ڈھونڈے کیا ہوئے چکڑ ڈبے ہتھ

اسی طرح بابا فرید نے استعارات کا استعمال بھی بھرپور کیا ہے کہتے ہیں:

فریدا ایہہ دِس گندلاں، دھریاں کھنڈ لِواڑ
اک راہندے راہندے رہ گئے اک رہندی گئے اجاڑ

یا پھر

کوک فریدا کوک توں، جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا ناں گرے، تب لگ کوک پکار

یہاں زندگی کے لئے 'ٹانڈے' کا استعمال کس قدر مکمل اور بے نظیر ہے۔ بابا فریدؒ نے دوسرے صوفی شاعروں کی طرح اپنے ماحول پر بھی نظر رکھی اور اپنی بات کو بہتر انداز میں سمجھانے کے لئے اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی مدنظر رکھا۔ کہتے ہیں:

کلر کیری چھپڑی آتے لتھے ہنجھ
چنجوں بوڑ نہ پیون اڈّن سندی ڈ: نجھ

یعنی کلر کے تالاب پر ہنس آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ وہ اپنی چونچ پانی میں ڈبو کر پانی نہیں پیتے بلکہ نہ ختم ہونے والی پیاس سمیت دوبارہ اڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے یہاں صنعت مرعات النظیر بھی ایک خاص ڈھب کے ساتھ سامنے آتی ہے، کہتے ہیں:

فریدا چِت کھٹولا وان ڈکھ برہ وچھاوِن لیف
ایہہ ہمارا جیوناں توں صاحب سچے ڈیکھ

ان کی شاعری میں تمثیلی انداز بھی جا بجا ملتا ہے جو کہ صوفی شعراء کا اپنا ایک رنگ ہے۔ کہتے ہیں:

فریدا جن لوئین جگ موہیا، سو لوئین میں ڈِٹھ
کجل دیکھ نہ سہندیاں سے پنکھی سوئے بہٹھ

بابا فرید نے شاعری، محض شعر کہنے کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس خطے کے لوگوں کو وہی کچھ بتانا چاہتے تھے۔ جس کا روحانی تجربہ از خود کر چکے تھے۔ اس لئے وہ طریقت اور شریعت کے ملے جلے ڈھنگ کو اپنا کر عوام کی اپنی زبان میں ان سے مخاطب ہوتے تھے۔ وہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے، اسی لئے وہ سادگی کے ساتھ اپنی شاعری میں اپنے آپ ہی سے مخاطب ہوتے تھے۔ یہی خوبی بعد ازاں دوسرے صوفی شعراء نے بھی اپنائی۔ انہوں نے حتی المقدور کوشش کی کہ اپنی بات کرنے کے لئے مقامی ماحول اور روائت ہی کو مدنظر رکھا جائے۔ اس کے بعد ان کے یہاں یہ خصوصیت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ مقامی ماحول میں محاورے اور کہاوتیں استعمال کرتے تھے وہ کہتے تھے

فریدا جے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
اپڑیں گریوان میں سرنیواں کرکے دیکھ

اسی طرح:

کندھی اُتے رُکھڑا کچرک بنے دھیر
فریدا کچے بھانڈے رکھئے کچرک تائیں نیر

اس شاعری اور اس کی مابعد الطبیعی فکر کی، آج کے انسان کو تو از حد ضرورت ہے۔ وہ اس لئے کہ جتنا ذہنی اور عملی انتشار اور جتنا علم و عمل میں تفاوت اور قول و فعل میں تضاد، آج کے دور میں ہونے لگا ہے۔ اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ اس دور میں انسان کو اتنے رول ادا کرنے پڑتے ہیں کہ تصادم ہو جانا یقینی سی بات ہے۔ اب تو اسی ضرورت کا احساس حد سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح انسان پھر سے ایک ہو جائے۔ یعنی اس کثرت میں کوئی وحدت پیدا ہو جائے اور یہ ضرورت اس نوع کی شاعری ہی پورا کر سکتی ہے۔ کیونکہ فکر مابعد الطبیعات ایک زندہ توانا، رواں اور محرک حقیقت بھی بن سکتی ہے۔ مگر اس شکل میں جبکہ یہ جدید ضروریات فرد سے ہم آہنگ ہو۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو بابا فرید کی شاعری اس ہم آہنگی کے لئے ہمہ وقت مستعد اور مکمل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس شاعری نے پنجاب کی سوندھی مٹی کے سفیر کی حیثیت سے ہر عصری دور میں، نوع انسان کے تمام تضادات کو دور کرنے اور سب رشتے جوڑنے کے لئے ہی مقدور بھی مساعی کی ہیں۔ اور کامیابیوں نے

اس کے قدم چومے ہیں۔

بابا فریدؒ کی شاعری اور روائت ہمیں اپنی جڑوں کی تلاش، قومی تشخص کا فہم اور اجتماعی شخصیت کا شعور حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ بابا فریدؒ کے افکار و تعلیمات، انسانی فکر و نظر، تہذیب و ثقافت کے فروغ اور اخلاقی پاکیزگی کے آدرش تک رسائی کے لئے، نہ صرف راہیں متعین کرتی ہیں بلکہ انکشاف ذات اور راہ نجات کے در بھی وا کرتی ہیں تا کہ ہم روشن تر منزلوں کی جانب سفر کر سکیں۔ بقول ایک دانشور کہ کیا ہمارے لئے یہ امر باعث فخر و انبساط نہیں کہ ہم دُنیا کی ایک نہائت عظیم الشان فکری روایت کے امین ہیں۔

بابا فریدؒ اور کشمیری شاعری میں تصوف

اسلامی تصوف کی تاریخ میں حضرت بایزید بسطامی کو ایک اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔ انہوں نے تصوف کے نظریے کو وجدان کی الہامی کیفیت سے ہم آہنگ کر کے اسے نئے معنی عطا کیے۔ اس ضمن میں مولانا رومی اور شیخ فریدالدین عطار کی تعلیمات نے بھی تاریخ اسلام میں تصوف کو ایک خاص فلسفہ کی صورت میں مشرق کے سامنے پیش کا جس کی بنیاد وحدت الوجود پر قائم ہے۔ صوفیاء کے مطابق خدا کی ذات ہر انسانی وجود میں جلوہ گر ہے کیونکہ خدا بجائے خود ایک ٹھوس شکل نہیں رکھتا اور صوفی کو ہر جگہ خدا کا جلوہ آشکارا نظر آتا ہے۔

نویں اور دسویں صدی میں تصوف پر دنیاے مشرق میں وسیع پیانے پر تحقیقی کام کا سلسلہ شروع ہوا جس کی بدولت اس فلسفے نے ایران اور افغانستان میں بھی مقبولیت حاصل کرلی۔ اس کے ساتھ ہی صوفی ازم کے پیروکاروں میں الگ الگ سلسلے قائم ہوئے جن میں کبروی نقشبندی، قادری، چشتی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سلسلوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ آبائی پس منظر یا متعلقہ علاقوں کی مذہبی افادیت کے ساتھ قایم کیا گیا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ ان سلسلوں کے بانیوں میں سے اگر چہ صوفیائے کرام بذاتِ خود کشمیر آ کر یہاں مدفون نہیں ہیں لیکن اُن سے منسوب خانقاہیں اور آستانے آج بھی وادی کشمیر ہر خاص و عام کے لئے فیض و برکت کا منبع ہیں۔

سرزمین کشمیر میں اسلام کے اولین مبلغ حضرت میر سید علی ہمدانی اور دیگر ممتاز صوفیاء یعنے حضرت سید غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی اور حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی بُخاری سے منسوب خانقاہیں شہر سرینگر میں نہ صرف کشمیری مسلمانوں کے لیے رشد و ہدایات کے محبوب مراکز ہیں بلکہ غیر مسلم عقیدت مند بھی ان مقدس مقامات پر جا کر وہاں اپنی والہانہ عقیدت اور بے پناہ محبت کا عملی اظہار کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں جب حضرت سید میر علی ہمدانی اسلام کی تشہیر و تبلیغ کے لئے واردِ کشمیر ہوئے تو ان کے ساتھ ہزاروں ایسے عقیدت مند ہم سفر تھے جنہیں حضرت نے کشمیر میں قریہ قریہ، بستی بستی اور گاؤں گاؤں میں اسلام کے پرچار کے کام پر مامور کیا۔ انہی بزرگوں کے آستانوں پر ہر سال میلے لگتے ہیں جن میں ہر مذہب اور عقیدت کے پیروکار شامل ہوتے ہیں۔

ان خدادوست اور خداپرست صوفیوں میں سے کئی ایک کے بارے میں مُصدقہ طور پر یہ معلوم نہیں کہ ان کا اصلی مذہب کیا تھا۔ کشمیر کی اولین صوفی شاعرہ للہٗ عارفہ کے بارے میں یہ حکایت مشہور ہے کہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر مادرزاد ننگی پھرا کرتی تھی۔ اُسی دوران جب اُس نے ایک دن حضرت میر سید علی ہمدانی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ گھبرا کر بھاگنے لگی۔ جب کسی نے للہٗ سے پوچھا کہ بھاگ کیوں رہی ہو تو اُس نے پریشانی میں کہا کہ میں نے زندگی میں آج پہلی بار ایک مرد کو دیکھا ہے جس کے سامنے میں برہنہ رہنے کی جسارت نہیں کرسکتی۔ للہٗ نے اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نانبائی کے دہکتے ہوئے تندور میں چھلانگ لگا دی۔ جب تندور میں دیکھا گیا تو وہاں سے پھول برآمد ہوئے جنہیں ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس میں بانٹ لیا اور للہٗ کی آخری رسومات اپنے عقائد کے مطابق ادا کیں۔ یہ واقعہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے۔

للہٗ عارفہ کا ہم عصر شیخ نورالدین نورانی تھا جس نے اپنے کشمیری کلام میں قران

کی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ حضرت شیخ کے بارے میں روایت ہے کہ جنم لینے کے بعد وہ اپنی ماں کا دودھ نہیں پیتا تھا جب للہ عارفہ نے یہ سنا تو اس نے ننھے شیخ کو اپنی گود میں لے کر اُس سے کہا "پی لے بھائی پی لے۔ جینے سے نہیں شرمایا تو پینے سے کیوں شرماتا ہے"۔ اس کے بعد نورالدین للہ کے پستانوں سے غٹا غٹ دودھ پینے لگا۔

کشف و کرامات سے بھرپور ان واقعات اور حکایات کی اگر چہ مستند طور پر تصدیق نہیں ہوسکی ہے لیکن ان کے پس منظر میں بھی اہل کشمیر کی اس فطری خاصیت کا اثر غالب ہے کہ انسان کوئی بھی اور کسی بھی قبیل کا ہوا سے مذہب پرستی کی نظروں سے جانچنا اور پرکھنا مناسب نہیں ہے۔

آج بھی کشمیر ان حکایات کو جھٹلانے کی اگر کوئی شخص علی الاعلان ہمت کرے تو اُسے فوری طور پر ملحد اور انکاری کہہ کر اُس کے ساتھ سبھی سماجی رشتے منقطع کیے جائیں گے۔

مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر صوفیاء کے بارے میں "تزک جہانگیری" میں ان دلچسپ حقائق کا اظہار کرتا ہے کہ "اگر چہ وہ یعنے صوفی، ریشی اور فقیر مذہبی تعلیمات سے کما حقہ بہرہ ور نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں دینی نزاکتوں کا علم ہے پھر بھی وہ سادگی اور صاف گوئی کے پیکر ہیں۔ وہ کسی کے خلاف قابلِ اعتراض زبان استعمال نہیں کرتے۔ وہ نفسانی خواہشات کو بس میں کیئے ہوئے ہیں اور صرف ایک روحانی جستجو میں مصروف ہیں۔ وہ گوشت کا استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی شادیاں کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کھیتوں میں میوہ دار درخت اگاتے ہیں تا کہ دوسروں کو اس کا فائدہ ہو۔ انہیں خود کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی"۔ جہانگیر نے ان صوفیاء کی تعداد دو ہزار بتائی ہے۔

سرزمین کشمیر برصغیر کا وہ واحد خطہ ارضی ہے جہاں تصوف یا صوفی ازم اور ریشی مت کے دھارے تین مذاہب ہندو دھرم، بُدھ مت اور اسلام کے سرچشموں سے پھوٹے ہیں اور اس مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی امتزاج نے کشمیر کو ایک مخصوص فلسفہ حیات کے مرکز کا رتبہ بخشا ہے۔

کشمیر میں تصوف کے سلسلے عقائد کو مختلف نام دئے گئے ہیں جن میں صوفی ازم، ریشی مت یا ریشی ازم اور تصوف وغیرہ شامل ہیں۔ اگر ان سبھی دھاروں کو ہم ایک ہی منبع

کے تناظر میں پہچاننے کی کوشش کریں تو میرے خیال میں جو اصطلاح ان آبھی کا احاطہ کرتی ہے وہ ہے کشمیریت۔ یہ لفظ اپنے اندر وہ گنج معانی رکھتا ہے جس کی بدولت آج بھی انسانیت کا یہ فلسفہ اور اخوت اور محبت کا نصب العین زندہ و پائندہ ہے۔

وادی کشمیر سارے برصغیر ہندوپاک میں معاشرتی ،تہذیبی ، ثقافتی ، جغرافیائی ، لسانی ، تاریخی اور اقتصادی لحاظ سے ایک الگ اور منفرد خطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا کشمیریت کے نظریئے کو بھی کشمیر کے باہر یا اُس سے ملحق علاقوں پر صادر نہیں کیا جاسکتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ کشمیریت کے فلسفہ کا آج کل کے سیاست دان اس کے معنی ومفہوم ذہن نشین کئے بغیر سیاست گری کے عمل میں غیر حقیقی لحاظ سے بے دریغ استعمال اور استیصال کرنے میں مصروف ہیں۔

ریشی مت اور تصوف کے ملغ کشمیری سخنوروں نے ہمیشہ مذہب کے اُن علمبرداروں کو ہدف تنقید بنایا ہے جو ظاہری نام ونمود کی خاطر مختلف مذاہب کی تعلیمات کو اپنی ہی وضع کردہ توضیحات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور باطنی پاکیزگی اور نفسانی برتری کے برعکس توہمات پر قائم کردہ رسوم ورواج کے کھوکھلے عقائد اور فرقہ واریت کو مذہب پرستی کا نام دیتے رہے ہیں۔

للہ عارفہ نے اس فرسودہ روایت پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جب اس نے کہا:

مورتی ہو دیوتا کی یا ہو مندر کی نمود
دونوں کی تشکیل میں پتھر ہی پتھر ہیں یہاں
زیرو بالا پیش و پست پتھر ہی پتھر پائے گا
تو پرستش کس کی کرتا ہے بتا پنڈت مجھے

کشمیر کی ہم عصر تاریخ کا ہر صفحہ اسی تصوف اور ریشیت کے افکار سے آج بھی مالا مال ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین پر اگرچہ گذشتہ چھ سو سال کے دوران مختلف مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے پھر بھی یہاں الگ الگ مذاہب کے پرستاروں کے درمیان رفاقت، میل ملاپ اور بھائی چارے کی فضا مکدر نہیں ہوسکی۔

۱۹۴۷ء کا خوں چکاں واقعہ جو چھ لاکھ انسانوں کی قیمتی جانیں لے کر ظہور پذیر ہوا کشمیر کے برادرانہ ماحول پر کسی بھی طرح سے اثر انداز نہیں ہو سکا جبکہ وادی کشمیر میں اُس وقت لاکھوں مسلمانوں کے مقابلے میں کشمیری ہندوؤں کی آبادی کا تناسب ایک فیصد سے بھی کم تھا۔ پڑوسی ریاست پنجاب میں گلی کوچوں میں بہنے والا انسانی خون کشمیر کے پانی کو داغ دار نہیں کر سکا۔

کشمیر اپنی ماحولیاتی انفرادیت اور قدرت کی کاری گری کے لحاظ سے صدیوں تک پیروں، فقیروں، سنتوں، سادھوؤں اور بھگتوں کے لئے عبادت الٰہی کا ایک پر سکون اور اہم مرکز رہا ہے جہاں فلک بوس پہاڑوں پر پھیلے جنگلوں اور فطری مناظر کے خوش آیند شب و روز میں اُنہیں فیضان الٰہی حاصل ہوتا رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ تصوف نے کشمیر میں دوسرے کئی علاقوں کی بہ نسبت زیادہ موثر طور پر اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں جو اب کشمیریت کے ایک تناور اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

کشمیر کے صوفیائے کرام نے کشمیریت کے اس مقامی تصور کی آبیاری کے لئے اس کے تحفظ کی خاطر کئی ایسے اصول وضع کئے جو انسانی زندگی کو ابدی منزلت کی بلندیوں تک لے جاتے ہیں۔ ان صوفی دانش وروں کے اپنائے ہوئے ان اصولوں میں خاص طور پر نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا، دنیاوی لذتوں سے بے پرواہ ہو کر گذرنا اور اپنے وجود کو کم سے کم تر بنا کر پیش کرنا شامل ہے تا کہ ایک پاک و صاف انسانی وجود کو خود اعتمادی اور خدا پرستی کا فیضان حاصل ہو۔

للہ عارفہ کے ہم عصر شیخ نورالدین ولی نے بھی جنہیں علمدار کشمیر بھی کہا جاتا ہے، نفس پر قابو پانے اور عالم عجز میں زندگی گذارنے کو ترجیح دے کر اپنے ان اشلوکوں میں کہا ہے:

پوہ سر پر آ چکا اور ہاڑ میں سوتا رہا
ہو سکا مجھ سے نہ لیکن ایک دن کا کام کاج
یاد آیا اُس گھڑی چلنے کے جب قابل نہ تھا
آ پڑا یم دوت ایسے میں جو مجھ کو لے چلا

شیخ العالم کا فلسفہ زندگی بنیادی طور پر اُن قرآنی تعلیمات کا شعری روپ ہے جن

میں انسان نوازی، عجز وانکسار اور خدا کے ساتھ ہم فکر اور ہم آہنگ ہونے کا درس واضح ہے۔ اس کے ہی نفس کشی کے لئے اس کلام میں بار بار اصرار کیا گیا ہے:

وائے مجھ کو نفس نے برباد کر کے رکھ دیا
مُنھ چھپا کر ہی رہا ہر آن تاریکی میں یہ
ہاتھ آجاتا اگر مجھ کو تو پھر کیا بات تھی
نفس ہی نے ڈھادئے پُل نیک اعمالی کے سب

قران کے تشہیری اور تبلیغی بیان کا ترجمہ ہونے کی بنا پر شیخ العالم کے کلام کو ''کشمیری قران'' کا درجہ دیا گیا ہے۔

حضرت بابا فریدؒ (۱۲۶۶-۱۱۷۳ء) للہ عارفہ سے تقریباً دو سو سال قبل گزرے ہیں۔ اُس زمانے میں ترسیل وابلاغ کے ذرائع لگ بھگ کالعدم ہی تھے لیکن حیرت اور دلچسپی کا مقام یہ ہے کہ بابا فریدؒ اور للہ کے خیالات میں ایک قابلِ غور مماثلت نظر آتی ہے۔ یہ دونوں صوفی سخن گو اگر چہ جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے کی ہمسایگی یعنے پنجاب اور کشمیر میں پیدا ہوئے تھے لیکن یہ قیاس بعد از امکان ہے کہ انہوں نے بھی ایک دوسرے کے خیالات اور محسوسات سے عملی طور پر آگاہی حاصل کی ہو۔ اس غور طلب امر کی وضاحت غالباً اس امکان کی موجودگی کے پیش نظر زیادہ مشکل نظر نہیں آتی کہ بابا فرید اور للہ عارفہ دونوں تصوف کے فلسفے اور خالق کائنات کے ساتھ ہم راز اور ہم ساز ہونے کی روحانی قوت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ شناسائی کے بغیر بھی اُن کے کلام میں وہی موضوعات واضح طور پر نمایاں ہوئے ہیں جو فلسفہ وحدت الوجود میں اعتقاد اور انسانی رشتوں کے تقدس پر بھرپور اعتماد اور ظاہری رواجوں سے قطعاً انکار کے فلسفہ سے سرشار ہیں۔

صوفی شعراء کے کردار کی یہ ایک خاصیت رہی ہے کہ زندگی میں عملی طور پر پاک باز اور باخلاق رہنے کے باوجود وہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو اُجاگر کرتے رہے ہیں اور ان کی خوداحتسابی کا یہ بیان بار بار ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بابا فریدؒ کہتے ہیں:

اپنے سیاہ کرتوتوں کے لبادے کا بوجھ اُٹھائے
میں کالے کپڑے پہن کر گھومتا ہوں

لوگ مجھے دیکھتے ہیں اور مجھے درویش کہتے ہیں

اب للہ عارفہ کا یہ واکھیہ ملاحظہ ہو:

نفس نے اپنے کیا ہے مجھ کو بس خوار و ذلیل
ہے طلبگار خورش ہر دم یہ مجھ سے مثل فیل
بچ کے نکلا ہے کوئی اس سے کسی کی کیا مجال
غالب آ کے کردیا ہے اس نے سب کو پائمال

اسی طرح ان اشعار میں بھی ایسے ہی خیالات کی ہم نوائی کا ایک دل نشین جلوہ نظر آتا ہے۔ بابا فریدؒ کہتے ہیں:

میں نے عشق کے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہے
مجھے ابھی بہت دور بہت دور جانا ہے
اور میرے سامنے کیچڑ بھرا راستہ ہے
اگر میں قدم بڑھاوں تو میں اپنا لباس میلا کروں گا
اور اگر ٹھہر جاؤں تو میں اپنا وعدہ توڑنے کا مرتکب ہوں گا

اور للہ عارفہ کا یہ واکھیہ:

شاہراہ عام سے گو آئی میں
جا سکی واپس نہ پھر اس راہ سے
میں ابھی تو بس کنارے پر ہی تھی
میں نے دیکھا اتنے میں دن ڈھل گیا
ڈال کر جب ہاتھ دیکھا جیب میں
آہ اُس میں ایک کوڑی بھی نہ تھی
پار دریا سے اترنے کے لئے
آپ ہی کہیے کہ کہ اب دوں گی میں کیا؟

کشمیر میں تصوف اور ریشی مت کے عقائد اور لائحہ عمل کو جن کشمیری شعراء اور صوفیاء نے گذشتہ کئی صدیوں میں اپنی فنی صلاحیتوں اور روحانی کمالات کے ذریعہ ایک خاص سمت بخشی ہے اُن میں خواجہ حبیب اللہ نوشہری، رحمان ڈار، شاہ قلندر، شمس فقیر، وہاب

کھار، احمد بٹواری، عزیز اللہ حقانی، صمد میر اور احد زرگر وغیرہ شامل ہیں۔
کشمیر کی کلچرل اکادمی نے ان صوفی شاعروں کے سوانح اور کلام پر مبنی تحقیقاتی تصانیف پہلے ہی کئی جلدوں میں شائع کی ہیں اور اس مقالے میں ان کے فکر وفن پر بحث کرنا وقت کی نزاکت کے پیش نظر ممکن نہیں۔ لہذا میں اپنے ان خیالات کو یہیں پر اختتام تک لاتا ہوں۔ شکریہ

اُٹھ فریدا سُتیا

جب میں نے بابا فرید پر سمینار کا انعقاد کرنے کے بارے میں سوچا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ بابا فرید پر کتنا مٹیریل مل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کئی دوستوں سے بات کرنی پڑی اور معلوم یہ ہوا کہ اردو میں بابا فرید پر زیادہ مٹیریل موجود نہیں ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے صوفی ازم پر بہت کام ہوا ہے۔لیکن بابا فرید پر قدرے کم مٹیریل فراہم ہو سکتا ہے۔ چونکہ میری ابتدائی زندگی وادی کشمیر میں گذری ہے اور اس وادی کے اثرات میرے ذہن میں ہمیشہ سے موجود ہیں اور میری تمام تر تحریروں میں کسی نہ کسی طرح کشمیر کی وادی، اُس کا حسن، اُس کی خوشبوئیں، اُس کے چشمے، اُس کے چنار، اُس کے پہاڑ شامل ہو جاتے ہیں۔ میرے دوست تو میرے میرے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان اور کشمیر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہوں اور اپنی تحریروں کے حوالے سے کشمیر کی حسین وادی کو سارے ہندوستان کے تہذیبی ورثے سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

یہ اسی وادی کا صدقہ تھا جہاں صوفی ازم رشیت کے نام سے شروع ہوا اور بہت بڑے بڑے صوفیوں نے اپنی تعلیم سے وادیٔ کشمیر کے رہنے والوں کو مستفید فرمایا۔ ابتدائی

زندگی کے کچھ سال وادی میں گذارنے کے بعد میں جموں آ گیا اور جب تک تعلیم ختم کر کے اور صحافت اور سیاست سے جُڑ کر دوبارہ سرینگر واپس نہیں پہنچا، میری زندگی کا وہ حصہ جموں ہی میں گذرا۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں جب میں ۱۹۳۹ء میں بی اے کا اسٹوڈینٹ تھا، اُن دنوں وہاں مجھے پروفیسر سِدھیشور وَرما صاحب کی رہنمائی ملی۔ پروفیسر سِدھیشور وَرما کئی زبانوں کے ماہر تھے، لیکن سنسکرت ان کا خاص فیلڈ تھا۔ کالج میں جب رِیسیس کا پیریڈ آتا جو تقریباً آدھ پون گھنٹہ کا ہوتا تھا، پروفسر سدھیشور ورما کے ۲۰۔۲۵؍ اسٹوڈینٹ جو ان کے بہت منظورِ نظر تھے، ایک کلاس روم میں جمع ہو جاتے اور پروفیسر سدھیشور ورما کسی نہ کسی موضوع پر والہانہ انداز میں اُن سے گفتگو کرتے۔ ایسی ہی ایک گفتگو کے دوران میرا تعارف بابا فرید سے ہوا۔ جب انہوں نے بابا فرید کا یہ شلوک پڑھا۔ اور پھر بڑے فلسفیانہ انداز میں اس کی تشریح کی۔

اٹھ فریدا سُتیا من دا دِیوا بال
صاحب جناں دے جاگ دے نفراں کی سونے نال

بابا فرید کے اس شلوک نے میرے ذہن میں ہلچل مچادی اور میں نے پروفیسر صاحب سے اس صوفی سنت کے بارے میں اور بھی جاننے کی کوشش کی۔ دراصل یہ میرا صوفی ازم اور بابا فرید سے پہلا ہلکا سا تعارف تھا۔ پروفیسر سدھیشور وَرما بیس پچیس برس پہلے یہاں چنڈی گڑھ میں قیام کرتے رہے تھے کیونکہ ان کے داماد جناب جگدیش چندر بھولا ڈپٹی سکریٹری ایجوکیشن تھے اور ان کی شریکِ حیات میری کالج فیلو تھی۔ مجھے تین چار سال تک یہ شرف حاصل رہا کہ میں کبھی کبھی پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور ان سے گفتگو کرتا رہتا تھا۔ یہ انہی کا فیض ہے کہ مجھے ادب، فلسفہ اور صوفی اِزم سے لگاؤ ہوا جو دھیرے دھیرے مضبوط ہوتا گیا۔ صوفی اِزم میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد اور صحافت اور سیاست سے جُڑ جانے پر مجھے اس زمانے میں سری نگر میں قیام کرنے کا موقع ملا، جب میری ادبی زندگی کی ابتداء ہو چکی تھی اور مجھے فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، جوشؔ ملیح آبادی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ساغر نظامی جیسے شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت ادبی محفلوں کا اہتمام کرنے اور ان

بڑے بڑے شاعروں کو مجاہد منزل میں مدعو کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مجھے وادی کے دور دراز مقامات پر اور بڑی بڑی زیارت گاہوں میں حاضری دینے کا موقع بھی ملا۔ میں نے زمانے میں رشیت کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ میری واقفیت نُند رشی، شاہ ہمدان روپا بھوانی، للا عارفہ اور حبہ خاتون سے ہوئی۔ اسی دوران مجھے کوٹلی کے ایک قصبہ پراٹلا میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں میرے ماموں جو پولیس میں انسپکٹر تھے کسی تحقیقات کے سلسلے میں گئے تھے۔ میں ویسے ہی گھومنے کی غرض سے ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ براٹلا گاؤں دراصل ایک بہت بڑے ٹیلے پر واقع ہے اور دور سے بڑا خوبصورت لگتا ہے۔ میں گھومتا گھماتا اس ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر پہاڑی پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ وہاں ایک فقیر کا مزار تھا جس پر سبز چادر چڑھی ہوئی تھی اور سرہانے بجھے ہوئے کئی چراغ رکھے تھے، جن سے رِستا ہوا تیل نیچے تک پہنچ رہا تھا۔ مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق ہوا کہ یہ مزار کس کا تھا، گاؤں کے جو لوگ تحقیقات کے سلسلے میں میرے ماموں جان کے پاس آئے تھے، اُن سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مزار محمد بخش کا تھا جو مشہور پنجابی کتاب ''سیف الملوک'' کے مصنف تھے۔ ان ہی میں سے ایک آدمی نے سیف الملوک کے کچھ شعر گا کر سنائے۔ سیف الملوک کو گانے کی ایک الگ لے ہے اور الگ ہی پہچان ہے۔ جو شعر میں نے آج سے ساٹھ برس پہلے سنے تھے ان میں سے مجھے اب صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔

اگلی گل سُنا محمدا سیف مُلو کے والی

اس طرح ابتدا ہوئی ان بڑے لوگوں سے میرے غائبانہ تعارف کی جن کے کلام میں صوفی ازم اور عشق حقیقی کے پہلو نمایاں طور پر موجود تھے اور وہ اپنی بات صرف علامتوں سے کہتے تھے۔ جب وہ عشق کی بات کرتے تھے تو وہ عشق حقیقی ہوتا تھا مجازی نہیں۔ اللہ تک پہنچے ہوئے یہ لوگ، خدا کی بات کرتے ہوئے، اُسے دنیا سے جوڑتے ہیں اور پھر خود دنیا سے ایک دم الگ ہو جاتے ہیں۔

بابا فرید گنج شکر کا شمار چھٹی صدی ہجری کے سبار صوفیاء میں ہوتا ہے۔ اس دور کے بارے میں خلیق نظامی لکھتے ہیں:

''دنیائے عجم میں بارہویں صدی عیسوی جنگ وجدل اور شوروہنگامہ کا دور تھا۔ طاقتور تُرکی قبائل رہنے کے لئے جگہ کی تلاش میں جنوب کی طرف بڑھ کر اپنی سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ جونہی مشرق کی طرف سے مزید دباؤ پڑتا وہ جنوب کی طرف اور بڑھ جاتے۔ ہر قبیلے کی حرکت سے بڑی بڑی آبادیاں منتقل ہو جاتیں۔ اس طرح بے شمار حکمران خاندان تباہ ہو گئے اور کئی شاہزادے گھربار چھوڑ کر محفوظ مقامات پر پناہ گزیں ہو گئے۔''

بابا فریدؒ کے آباؤاجداد جو طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس افراتفری کے زمانے میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ بابا فرید کے دادا جناب قاضی شعیب، شہاب الدین غوری کے عہد میں کابل سے لاہور تشریف لائے اور وہاں سے قصور منتقل ہو گئے، جہاں سے سلطان نیانہیں کھوتوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب کے تین صاحبزادے تھے جن میں سے ایک آپ کے والد، جمال الدین سلیمان تھے۔ آپ کے والد سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے۔ ان کی شادی کھتوال کے شیخ وحیدالدین خوجندی کی صاحبزادی محترمہ قرسم بی بی سے ہوئی۔ انہی کے ہاں ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں ایک ایسے بچے کی پیدائش ہوئی، جس کا شمار آگے چل کر قرونِ وسطیٰ کے معزز مشاہیر میں ہوا۔ یہ شخصیت حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی تھی۔ آپ کے والد کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کو ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے ملی جو کہ ایک نہایت پارسا اور عابد وزاہد خاتون تھیں۔ آپ نے کھوتوال میں گیارہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ اسی زمانے میں آپ کی تعلیم، ذہانت اور نیکی کا چرچا پورے شہر میں ہو گیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملتان تشریف لائے۔

بابا فریدؒ کو گنجِ شکر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس تعلق سے مختلف روایات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک اس طرح ہیں۔

ایک روایت تو یہ ہے کہ جب کئی روز کی مسلسل فاقہ کشی کے بعد ایک رات بھوک کی شدت کی وجہ سے چند کنکریاں منہ میں ڈالیں تو وہ شکر کی ڈلیاں بن گئیں۔

دوسری روایت کچھ یوں ہے کہ ایک تاجر اجودھن آیا۔ اس کے پاس شکر تھی۔ لیکن اس نے بابا فرید کے سامنے جھوٹ بولا اور اس شکر کو نمک بتایا۔ لیکن جب اس نے بوریاں

کھولیں تو اس میں شکر کی بجائے نمک برآمد ہوا۔ وہ شخص واپس آیا، معافی مانگی اور نمک کو شکر میں بدلنے کی درخواست کی، جس پر وہ نمک شکر بن گیا۔ اس لئے آپ شکر گنج مشہور ہو گئے۔

اسی طرح ایک مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کو بچپن میں شکر بہت شوق تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں کہا کہ جو بچہ صبح کی نماز پڑھتا ہے اللہ اسے شکر دیتا ہے۔ چنانچہ والدہ رات کے وقت شکر کی پڑیاں بابا کے سرہانے رکھ دیتیں تا کہ وہ صبح کی نماز پڑھے۔ بارہ سال کی عمر تک تو یہی ہوتا رہا۔ بعد میں والدہ نے شکر رکھنی بند کر دی لیکن قدرت کی طرف سے شکر کا اہتمام جاری رہا۔ یعنی انہیں پردۂ غیب سے شکر مل جاتی۔ اسلئے بابا فرید کا نام گنج شکر پڑ گیا۔

ملتان میں آپ کی ملاقات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوگئی۔ وہ آپ سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے آپ کو حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔

کچھ عرصہ کے بعد آپ ملتان سے قندھار تشریف لے گئے اور وہاں پانچ سال تک مسلسل عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔

بابا فرید کا شمار حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بہترین خلفاء میں ہوتا ہے۔ جن کو دیکھ کر خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا تھا "بابا فرید ایک شمع ہے جس سے درویشوں کا سلسلہ روشن ہوگا۔"

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حکم پر بابا فرید نے چلۂ معکوس کھینچا۔ موذن رات کو آپ کا پاؤں رسی کے ساتھ باندھ کر درخت سے باندھ کر آپ کو کوئیں میں الٹا لٹکا دیتے۔ آپ ساری رات عبادت کرتے اور صبح نماز فجر سے قبل آپ کو کوئیں سے باہر نکال لیا جاتا۔

بابا فرید گنج شکر کا تعلق ہریانہ سے بھی ہے۔ انہوں نے کافی عرص ہانسی میں قیام فرمایا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات کے بعد وہ دلی تشریف لائے۔ لیکن دلی کے حالات دیکھ کر وہاں رُکے نہیں اور اجودھن (پاک پٹن) تشریف لے گئے۔ بابا فریدؒ نے اجودھن میں صوفیانہ روایات کے مطابق ایک جماعت خانہ تیار کیا اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

باباؒ فریدؒ نے قرآن مجید کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے آپ سے قرآن شریف کے چھ پارے پڑھے تھے۔

اردو زبان کی ابتدائی تشکیل و تعمیر کے دور میں جن صوفیاء کا نام آتا ہے ان میں حضرت بابا فریدؒ سرِ فہرست ہیں۔ ان کے ساتھ نہ صرف جملے اور فقرے منسوب ہیں بلکہ شعر و شاعری کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ بھی ان کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری اس زبان میں ہے جو اس دور میں مروج تھی۔ اس زبان کو جو نام بھی دیا جائے بہر حال اس میں ملتانی، پنجابی اور ہندی کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی ابتداء ہیئت میں ان زبانوں کا کتنا گہرا دخل رہا ہے۔ بابا صاحب کے جملوں اور شاعری کے نمونوں کو اردو، سرائکی اور پنجابی شاعری کے ارتقاء اور اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما کے سلسلے میں تاریخی تقدم حاصل ہے اور کم و بیش تمام ماہرینِ لسانیات نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بابا فریدؒ کے جملوں اور شعروں کی مثالیں درج کی ہیں۔

اسی طرح بہت سے اشعار اور کافیاں بھی بابا فریدؒ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب بابا فریدؒ نے ایک کنویں میں چلۂ معکوس کاٹا تھا۔ اسی دوران یں ایک کوّا آپ کے جسم پر آ بیٹھا اور چونچیں مارنے لگا۔ آپ نے منع نہیں کیا۔ لیکن جب کوّے نے آنکھ پر چونچ ماری تو آپ نے فرمایا:

کاگا کُرنگ ڈھنڈولیا، سگلا کھایا ماس
اِیہہ دو نَینا مَت چھوہیو، پر دیکھن کی آس

اے کوّے! تو نے میرے بدن کا سارا گوشت کھرچ کر کھالیا ہے۔ میں تم سے منت کرتا ہوں کہ یہ میری دو آنکھیں نہ کھانا کیونکہ مجھے اپنے پیا کو دیکھنے کی آس ہے۔

یہ بھی روایت ہے کہ آپ لاہور سے روانہ ہو کر اجودھن (پاک پٹن) پہنچے تو آپ نے اس جگہ کو پسند فرمایا۔ حالانکہ وہاں کے لوگ ناقدر شناس اور بدذوق و بدمزاج تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

فریدا اُتھاں ٹِکیے جتھاں وَسن انھے
نہ کوسا کو جانے نہ کوسا کو منے

(یعنی اے فرید! وہاں رہنا چاہئے جہاں اندھے رہتے ہوں تا کہ نہ کوئی ہمیں جان سکے اور نہ ہی کوئی ہم کو مان سکے۔)

میں بابا فریدؒ کے کچھ اور شلوک یہاں درج کر رہا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا فرید ایک بہت پہنچے ہوئے درویش تھے اور انہوں نے صوفی رجحانات کو ایک ایسے مقام پر لا دیا تھا جس مقام پر پہنچنے کے لئے جب تک خدا کا کرم ساتھ نہ ہو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

آپ سَنواریں میں ملیں، میں مِلیاں سُکھ ہوءِ
فریدا جے توں میرا ہو رہیں سبھ جگ تیرا ہوءِ

(بابا فرید فرماتے ہیں کہ اے بندے اگر تو نے آپ کو سنوار لے تو تمہیں رب مل جائے گا۔ اگر ایک دفعہ خدا کا وصل نصیب ہو گیا تو تمام دنیا تمارے قبضہ میں آ جائے گی۔

مُلاں تے مشالچی دوویں اِکو چِت
لوکاں کردے چاننا، آپ ہنیرے نِت

(مُلا اور مشعل بردار دونوں ہی ایک جیسے ہیں وہ لوگوں کے لئے تو روشنی کرتے ہیں اور خود اندھیرے میں رہتے ہیں۔)

کوک فریدا کوک توں جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرے، تب لگ کوک پکار

(بابا فرید کہتے ہیں کہ اے بندے تو زور زور سے پکارتا رہ۔ جس طرح کسان اپنے جوار کی فصل کی اونچا اونچا چلا کر حفاظت کرتا ہے جب تک جوار کی فصل کا ایک ایک ٹانڈا ایک نہیں گرتا جب تک اونچا اونچا چلا کر فصل کی حفاظت کرتا رہ۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ کو اپنی حرص، تکبر وغیرہ کو پنے قبضہ میں رکھنا چاہئے اور غلط جذبات کو اپنے آپ پر غالب نہیں ہونے دینا چاہئے۔

فریدا خاک نہ نِندیئے خاکو جیڈ نہ کوءِ
جیوندیاں پیراں تلے، مویاں اُپر ہوءِ

(بابا فرید کہتے ہیں مٹی کو بُرا نہ کہو جب تک آدمی زندہ ہے مٹی پاؤں تلے روندی جاتی ہے اور جب آدمی مر جاتا ہے اور قبر میں دفن ہو جاتا ہے تو وہی مٹی اس کے اوپر رکھی جاتی

ہے۔

میں آج بھی اپنے مہربان گورو پروفیسر سدھیشور ورما کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بابا فرید کا یہ شلوک ساٹھ برس پہلے سُنا کرا تنے عظیم صوفی سنت سے میرا تعارف کروایا تھا۔

اُٹھ فریدا سُتیا من دا دیوا بال
صاحب جناں دے جاگ دے نفراں کی سونے نال

مجھے لگتا ہے کہ میں بہت دیر تک سویا رہنے کے بعد اب جاگ گیا ہوں اور اپنے فرض کو پہچان رہا ہوں۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی عظمت وانفرادیت

فرید الدین مسعود نے جب ۵۸۴ھ میں ایک خدا رسیدہ نیک خاتون بی بی قرسم کے گھر میں جنم لیا تو صاحب عرفان لوگوں نے والدہ کو نوید دی کہ یہ لڑکا آگے چل کر روحانیت وتصوف کے میدان میں بہت بلند مقام اور نام پیدا کرے گا۔ اور اس کا نام دنیا کے گوشے گوشے میں علم وعرفان اور نیکی کی علامت بن کر چمکے گا۔ آپ کی والدہ مولانا وجیہہ الدین خجندی کی دختر تھیں۔ نسب نامہ پدری امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب سے مل جاتا ہے۔ آپ کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کے خاندان سے تھے۔ جب کابل کی لڑائی میں آپ کے مورث اعلیٰ نے شہادت پائی تو آپ کے دادا قاضی شعیب اپنے شہزادوں اعزاز الدین محمود، جمال الدین سلیمان اور نجیب الدین محمد متوکل اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ لاہور تشریف لے گئے لیکن لاہور کی فضا سازگار محسوس نہیں ہوئی تو قصور تشریف لے گئے وہاں انہیں کھتوال کا قاضی مقرر کیا گیا اور وہ وہیں رہنے لگے۔ جمال الدین سلیمان کی شادی وجیہہ الدین خجندی کی دختر قرسم بی بی سے ہوئی اور ان کے بطن سے حضرت باباؒ مسعود پیدا ہوئے۔

باباصاحب کی ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ کی زیرنگرانی ہوئی انہوں نے باباؒ کے دل میں محبت الٰہی کی ایسی چنگاری پیدا کی جس نے آگے چل کران پر پورا تسلط کرلیا۔ بارہ برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا جب آپ کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو ملتان تشریف لائے اور مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی معروف کتاب ''نافع'' پڑھی اور علوم دینیہ حاصل کیے پھر آپ قندھار تشریف لے گئے وہاں پانچ برس قیام فرمایا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف و نحواور منطق وغیرہ میں اعلیٰ قابلیت حاصل کی۔ حضرت باباؒ ریاضت، عبادت، معاہدہ، فقراور ترک وتجرید میں بے نظیر تھے۔ شہرت پسند نہ فرماتے تھے آپ کواستغراق بہت پسند تھا۔ تحمل، بردباری، قناعت، توکل، تقویٰ، ذوق وشوق کا مجسمہ تھے۔ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ شربت کے ایک پیالے سے جس میں مقی ہوتی افطار کرتے تھے۔ تھوڑا خود پیتے تھے باقی حاضرین میں تقسیم فرمادیتے تھے۔ دوروغنی روٹیوں میں سے ایک خود تناول فرماتے اور دوسری روٹی کے ٹکڑے کرکے حاضرین کو تقسیم کردیتے تھے۔ آپ کی پوشاک شکستہ ہوتی تھی، آپ کے پاس صرف ایک کمبل تھا جو اتنا چھوٹا تھا کہ جب پیروں پر ڈالتے تو سر کھل جاتا اور جب سر پر ڈالتے تو پیر کھل جاتے۔ آغاز عمر ہی سے حضرت باباؒ کی نیکی اور زہد کے چرچے تھے۔ ایک دن اپنے آبائی قصبے کھتوال میں ان کی ملاقات خواجہ بختیار کاکیؒ سے ہوئی جو ان دنوں وہاں آئے ہوئے تھے۔ حضرت بختیار کاکیؒ نے حضرت بابا پر خصوصی توجہ دی، نتیجے میں نوعمر فرید انکا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا اوران کی روحانی غلامی ک دائرے سے پھر کبھی باہر نہیں نکل سکا۔ کچھ عرصہ خواجہ بختیار کی خدمت میں زندگی گزارنے کے بعد حضرت بابا کو مرشد سے ہدایت ملی ''فرید علم کی تلاش میں کمربستہ ہوکر سفر پر جا۔ علم ہی انسان کو مکمل انسان بناتا ہے اور بے علم زاہد شیطان کے ہاتھوں شکست کھاجاتا ہے'' بابا فرید نے اپنے پیرومرشد کی ہدایت پر عمل پیرا ہوکر قندھار کا سفر اختیار کیا۔ جہاں ان دنوں شیخ بہاؤ الدین سہروردی، شیخ فریدالدین عطانیشاپوری اور شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کا بہت چرچا تھا۔ بابا فرید نے پانچ سال تک ان بزرگوں کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تحصیل علم وعرفان کرتے رہے لیکن اصل فیض انہوں نے اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ سے حاصل کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت بابا فرید اپنے پیرومرشد کی خانقاہ میں قیام پذیر تھے ان ہی دنوں

حضرت خواجہ معین الدین چشتی بھی اسی جگہ تشریف فرما ہوئے اور خانقاہ میں مہمان رہے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ نے اپنے تمام شاگردوں کو خواجہ معین الدین چشتی سے ملاقات کے لیے حاضر کیا مگر ان میں بابا فرید شامل نہ تھے وہ ان دنوں خانقاہ کے ایک حجرے میں چلّہ کشی میں مصروف تھے۔ خواجہ چشتیؒ تمام خلفاء سے ملاقات کر چکے تو خواجہ بختیار کاکی سے دریافت فرمایا ''کیا کوئی اور مرید یا خلیفہ ملاقات سے رہ گیا ہے'' انہوں نے عرض کیا ''مسعود نامی ایک مرید حجرے میں ہے مگر وہ چلّہ کشی میں مصروف ہے اس وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا''۔ خواجہ چشتیؒ نے فرمایا ''ہم خود اس سے ملاقات کے لیے اس کے پاس جائیں گے''۔ یہ کہہ کر حضرت بختیار کاکی کے روکنے کے باوجود حجرے میں داخل ہوگئے۔ بابا فرید بے اختیار مؤدب کھڑے ہوگئے لیکن مسلسل فاقہ کشی اور چلّہ کشی کے باعث ضعف طاری تھا۔ اٹھنے کی کوشش ناتمام رہی، لڑکھڑا کر خواجہ معین الدین چشتی کے قدموں میں گر گئے اور نم آنکھوں سے ندامت کا اظہار کی۔ خواجہ چشتیؒ نے سہارا دے کر اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ بابا فرید کے سینے میں روشنی منتقل ہوگئی اور نقاہت دور ہوگئی۔

حضرت بختیار کاکیؒ سے کسب فیض حاصل کرنے کے بعد بابا فرید ہانسی میں مقیم ہوگئے۔ ہانسی کی حیثیت ایک چھاؤنی کی تھی اور بابا صاحبؒ کا خیال تھا کہ وہ یہاں آرام و سکون کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مصروف رہ سکیں گے اور عوام انہیں تنگ نہیں کریں گے مگر ایک واقعہ سے ان کی شہرت پھیل گئی۔ ایک روز مولانا ترک جو ایک معروف صوفی اور خطیب تھے ہانسی پہنچے۔ مسجد میں ان کا وعظ تھا۔ بابا فرید بھی ان کا وعظ سننے کے لیے گئے۔ ان کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور ان کی ظاہری کیفیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہت بڑے مذہبی اور عالم فاضل ہیں۔ انکی معزز مہمان سے کوئی واقفیت بھی نہیں تھی۔ مگر جونہی وہ مسجد میں داخل ہوئے مولانا ترک بول اُٹھے:

''اے لوگو! صرّافِ سخن آ پہنچا ہے۔''

ہر ایک کی آنکھیں بابا فریدؒ کی طرف اٹھ گئیں۔ مولانا ترک نے باباؒ کی بیحد تحسین و مدح کی۔ مولانا ترک کے وعظ نے بابا صاحبؒ کو ہانسی میں مشہور کردیا لوگ کثرت سے ہانسی آنے لگے۔ ہانسی میں قیام کے دوران ہی شیخ جمال الدین ان کے حلقۂ مریدان میں

شامل ہو گئے۔ وہ بابا صاحب کے بڑے محبوب مرید تھے اور انہیں کی محبت کی وجہ سے بابا کئی برس ہانسی میں مقیم رہے۔ ان کے ہانسی میں زمانۂ قیام کے بارے میں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ انیس بیس برس وہاں رہے اور حضرت خواجہ بختیار کاکی کی وفات کے چند سال بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔ جب بابا صاحب نے پیر و مرشد سے دہلی چھوڑنے اور ہانسی جانے کی اجازت طلب کی تو فرمایا: ''مجھے معلوم ہے تم ہانسی جاؤ گے۔'' بابا صاحب بولے حضرت جیسا حکم کریں تعمیل کروں گا۔'' خواجہ بختیار کاکیؒ نے فرمایا ''یہ مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ تم میری وفات کے وقت موجود نہیں ہو گے۔''

بابا فرید ارباب حکومت اور برسرِ اقتدار ہستیوں کی محبت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جب آپ نے شہرت حاصل کی اور دور دور تک آپ کی کرامات کا ذکر ہونے لگا تو بہت سے امراء اور بادشاہ بھی آپ کے معتقد ہو گئے اور آپ کو دنیاوی آسائشیں پہنچانے کی درخواست کی جو آپ نے مسترد کر دی۔ آپ کی زندگی کا اولین مقصد اسلام کی تبلیغ تھا جس میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ آپ کے کلام میں ایسی تاثیر تھی کہ پنجاب میں گاؤں کے گاؤں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔

بابا فرید کو شیرینی بہت پسند تھی اور شکر آپ کی پسندیدہ تھی اس بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار شکر کے بیوپاری گدھوں پر شکر کی بوریاں لادے ہوئے آپ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ان سے شکر قلیل مقدار میں خریدنی چاہی۔ اس لیے انہوں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا شکر نہیں نمک ہے۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا ''ٹھیک ہے نمک ہی ہوگا۔'' وہ سوداگر جب منزلِ مقصود پر پہنچے اور بورے کھولے تو دیکھا سب میں شکر کے بجائے نمک تھا۔ پشیمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر دعا کے طالب ہوئے۔ آپ نے فرمایا ''شکر ہو جائے گی۔'' چنانچہ وہ نمک شکر ہو گیا، کہتے ہیں اس روز سے آپ ''گنج شکر'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

ایک مرتبہ چھ درویش آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مسافر ہیں زادِ راہ چاہتے ہیں اس وقت آپ کے سامنے چند خرمے رکھے ہوئے تھے آپ نے وہ خرمے اٹھا کر دے دیے ان درویشوں کو ناگواری ہوئی کہ بجائے زادِ راہ کے خرمے دے

دیے۔ انہوں نے ان خرموں کو پھینکنا چاہا، پھینکتے وقت جوان کی نظر خرموں پر پڑی تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی بھی کہ وہ خرمے زرِ خالص کے ہو گئے ہیں۔"

بابا صاحب کی طبیعت میں بڑا توازن اور سکون تھا۔ انتہائی بدترین اشتعال کے سامنے بھی برہمی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ دوسروں کی خطائیں معاف کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمن کو بھی خوش رکھنے میں اعتقاد رکھتے تھے۔ ہندو یوگی اکثر ان کی خانقاہ میں آتے تھے اور کبھی کبھی خانقاہ میں رہنے والے ان سے اہم اور دلچسپ موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ان یوگیوں سے گفتگو اردو کی بالکل ابتدائی شکل میں ہوتی تھی۔ بابا صاحب یہ زبان اچھی طرح بول لیتے تھے واقعہ یہ ہے کہ ان کی خانقاہ اردو زبان کا اولین گہوارہ تھی۔

حضرت بابا کی وفات ۶۶۱ھ میں ہوئی اس وقت سے لے کر اب تک برِصغیر نے بے شمار تبدیلیاں دیکھیں، حکومتیں بنیں اور تباہ ہو گئیں، تہذیبیں آئیں اور ختم ہو گئیں لیکن ان تمام تغیرات اور انقلابات کے باوجود حضرت باباؒ کا مزار لوگوں کے لیے بے انتہا احترام و محبت کا مرکز بنا رہا۔ تیمور نے جب ہندوستان پر طوفانی حملہ کیا اور اس کی تباہ کاری سے کوئی ایسا شہر نہیں بچا جو اس کے راستے میں آیا لیکن اس نے اجودھن کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا اور بابا صاحبؒ کے مزار پر نہایت عقیدت و احترام سے حاضری دی۔ آج بھی ہندو، مسلمان اور سکھ انہیں بڑے احترام و عقیدت کی نظروں سے دیکھتے اور ان کی تعظیم کرتے ہیں۔

ہانسی اور بابا فرید الدین گنجِ شکرؒ

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سال کے بعد سال گزرتے ہیں۔ وقت ہزاروں کروٹیں لے لیتا ہے۔ دریاؤں کا ہزاروں گیلن پانی سمندر سے ہم آغوش ہوجاتا ہے تب کہیں جا کر نظر آتی ہے کسی دیدہ ور کی صورت جس طرح بہت سے شیشے بھٹی میں پگھلنے پر ایک پیمانہ بنتا ہے۔ جس طرح نظامِ شمشی ہزاروں گردش کر چکا ہوتا ہے۔ اور تب کہیں جا کر سرجن ہار کی کتنی مخصوص ہستی پر نوازشات، مہربانیوں اور عنایتوں کی بارش ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر کامل انسان عزم اور روحانی طور بلند قامت فقیر دنیا میں امن شانتی، انسانیت خلق خدا میں آپسی محبت گناہ گاروں اور گمراہوں کو راہِ نجات دکھانے کے لئے آتا ہے۔

اُنہیں برگزیدہ ہستیوں میں ایک پاک شخصیت حضرت بابا شیخ فرید گنج شکر کی بھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی مردِ کامل کا پیدا ہونا ایک روشنی ایک کرشمہ ہوتا ہے۔

دیدہ ور مُرشد کا ہونا ایک عظیم، عجب، انوکھا واقعہ اور بے جوڑ بات ہوتی ہے۔ اس دھرتی پر بابا حضرت با فرید جیسے پھول روز نہیں مہکتے کامل تو بہت ہو سکتے ہیں۔ مگر کامل

مُرشِد اور رہنما گنے چنے ہوتے ہیں۔ حضرت بابا فریدؒ صوفی ازم کے آسمان پر چودہویں کے چاند تھے۔ اُن کا صوفی سنتوں میں نام ایسا ہے۔ جیسا کہ کوئی اندھیرے میں شمع روشن کردے۔ جیسے صحرا میں کوئی نخلستان ہو، جیسے پہاڑ سے کوئی چشمہ پھوٹ رہا ہو۔ اور ہزار ہزار لوگوں ک دلوں ذہنوں اور نظروں کو شرابور کرکے انہیں سرتاپا تصوف کی لہروں سے بھگودے۔ وہ روحانیت کے سرتاج تھے۔ ان کی حیات اور کارناموں کا احاطہ کرنا جوئے شیر کے مترادف ہے۔ لہٰذا میں صرف ان کے ہانسی ضلع حصار کے بیس سال کے قیام کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

ہانسی کو روانگی اور قیام:

تربیت مکمل ہوجانے کے بعد بابا فریدؒ کے پیرومُرشِد قطب القطاب حضرت قطب الدین بختیار کاکی چشتیؒ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ہانسی جاکر اپنی خانقاہ اور درس گاہ تعمیر کریں۔ ہانسی میں بابا فریدؒ نے بڑی ریاضتیں کیں بعض اوقات وہ گھنٹوں عالمِ تفکُر میں کھڑے رہتے تھے اور بیٹھنے کا ہوش نہیں آتا تھا۔ ماہِ رمضان المبارک میں ہر رات دو مرتبہ قرآنِ حکیم ختم کرتے اور بعض راتوں میں دس دس پارے مزید پڑھ جاتے تھے۔ آنکھیں ہر وقت پُرنم رہتی تھیں۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ اکثر دن فقر و فاقہ میں گزرتے تھے۔

بابا فریدؒ کے ہانسی روانہ ہونے سے پہلے خواجہ قطب الدین کاکی نے فاتحہ پڑھوائی اور اعلان کیا کہ اُن کے بعد حضرت بابا فرید شکر گنج ان کے جانشین ہوں گے۔ حضرت خواجہ قطب الدین نے اپنی جائے نماز اور عصا دے کر اُن کو ہانسی کے لئے روانہ کیا۔

ہانسی میں ہر وقت عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنے کی وجہ سے بہت کم لوگ اُن سے واقف اور متاثر تھے۔ ایک بار مولانا نورالدین تُرک جب ہانسی گئے تو بابا فرید بھی اُن کا وعظ سننے کے لئے گئے ان کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ کپڑے تار تار اور پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت نورالدین نہ تو بابا فرید سے آشنا تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اُنکو دیکھا تھا۔ لیکن جیسے ہی بابا فریدؒ نے مسجد میں قدم رکھا تو مولانا نور تعظیم میں کھڑے ہوگئے۔ اور بلند آواز میں کہا کہ اے لوگو دیکھو حرافِ سخن وارد ہوتے ہیں۔ سب حاضرین کی نگاہیں بابا کی طرف اُٹھ گئیں۔ حضرت نور نے بابا فریدؒ کی بہت تعریف کی۔ نتیجتاً بابا فرید ہانسی اور

گردونواح میں مشہور ہوگئے۔ ان کے گرد ہزاروں مرید اکٹھا ہوگئے۔ اس طرح وہ وقت آگیا جس کے متعلق حضرت بختیار کاکی کے حجرے میں پیشن گوئی کی گئی تھی۔ انہوں نے حضرت بختیار کاکی سے کہا تھا کہ بختیار آپ کے ہاتھ میں وہ طاقت ہے جو اپنے روشن چراغ سے درویشوں کے دلوں کو منور کرے گی۔ بابا فریدؒ کشت وکرامات کو نہ تو کوئی اہمیت دیتے تھے اور نہ ہی ان کے پابند تھے۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ میں چار چیزوں کا علم حاصل کرلیا ہے۔ اور دنیا کے تمام علموں سے نجات پالی ہے۔ پہلا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا رزق مقرر ہے۔ کم زیادہ نہیں ہوسکتا۔ میری حرص وخواہش سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ دوئم یہ کہ یہ جانا کہ خدا تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے اُسے میرے سوا اور کوئی ادا نہیں کرسکتا۔ اس لئے میں پوری توجہ سے یہ حق ادا کرنے میں مشغول ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں سمجھ گیا کہ موت سے فرار ممکن نہیں ہے لہٰذا میں اس کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ آخری یہ کہ علم مجھے ہوگیا ہے کہ میرا آقا میرے ہر فعل سے پوری طرح آگاہ ہے یاد رکھو کہ تلاشِ رزق نہ تو فرض ہے اور نہ ہی سنت لہٰذا اس کی جستجو بے سود ہے۔ کیونکہ رزق تو ہمیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رزق از خود تمہارے پاس پہنچتا ہے۔ تمہاری جستجو کی ضرورت نہیں۔ بابا فریدؒ نے ہانسی میں رہ کر تنہائی کا بھر پور فائدہ اٹھایا اور صوفی ازم کی چاروں منازل عالمِ ناسوت۔ عالمِ ملکوت۔ عالمِ جبروت اور عالمِ لاہوت سر کیں۔ ہانسی میں بیس سالہ قیام کے دوران انہوں نے دینی تعلیم کے ساتھ علومِ ظاہری اور علمِ باطنی میں بھی کمال حاصل کیا۔ اور شریعت وطریقت میں عروج تک پہنچے۔ حدیث فقہ، منطق اور تصوف میں مہارت پیدا کی۔ وہ اپنا زیادہ وقت ریاضت اور عبادت میں صرف کرتے تھے۔ یہ ایک فطری حقیقت تھی کہ بابا فرید نے خدمتِ خلق پارسائی اور محنت سے ہانسی اور ہانسی کے لوگوں کا دل جیت لیا تھا۔ وہ ہندو اور مسلمان میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ اُنکو یہ غیر مسلم کافر ہیں ناگوار گزرتا تھا۔ غرضیکہ شانتی، امن مذہبی، رواداری، محبت اور انسان دوستی کا ایک دریا بہادیا۔ بابا فریدؒ نے اپنے پیرومُرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی اجازت سے چلہ معکوس کرنے کا ارادہ کیا تو ایک ایسے کنویں کی تلاش تھی جو لوگوں کی آمد ورفت سے دور ہو اور عوام کی نظروں میں نہ ہو۔ لہٰذا تلاش وجستجو کے بعد ہانسی کے ہی رہنے والے ایک مرید رشید الدین کی امداد سے

ایک کنواں مل گیا جو درختوں کی ٹہنیوں اور گھاس سے ڈھکا تھا۔ اور یہ گمان ہونا بھی ناممکن تھا کہ ایسی ویران جگہ بھی کنواں ہو سکتا ہے۔ کنویں کی تلاش کے بعد ایک ایسی آدمی کی جستجو تھی جو بابا فرید کو ۴۰ دن رات کا چلہ ادا کرنے میں مددگار ہو۔ آدمی نیک فقیر اور بھروسے کا ہو جو کسی پر اس راز کو افشاں نہ کرے چنانچہ رشید الدین کی مدد سے یہ مسلہ بھی حل ہو گیا ایک موذن تلاش کیا گیا۔ بابا فرید نے موذن کو تین دن اور تین رات نظر رکھ کر موذن کو پرکھا کہ وہ راز کو چھپانے لائق ہے کہ نہیں۔ جب ان کی تسلی ہو گئی تو ایک رات بابا فریدؒ نے موذن سے ایک رسہ منگایا۔ رسے کا ایک سرا بابا فرید کی ٹانگوں میں باندھا گیا اور دوسرا کنویں پر جھکے ہوئے ایک درخت کے تنے میں باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد ہدایت کی کہ وہ انہیں کنویں میں الٹا لٹکا دے اور سویرے آ کر رسے کو کھینچ کر انہیں باہر نکال لے۔ لہٰذا یہ عمل پورے چالیس رات جاری رہا۔ موذن رات کو بابا کو کنویں میں لٹکا دیتا اور سویرے نکال لیتا۔ ایک مورخ کے مطابق کوئی نہیں جانتا کہ بابا فریدؒ نے کتنے چلے معکوس ہانسی میں قیام کے دوران کیئے۔

بابا فرید کا مزاج اور طبیعت اتنی حساس ہو گئی تھی کہ ایک بار جب مرید نے ان کے سامنے کھانا رکھا اور انہوں نے کھانے میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ میں بھاری پن محسوس ہوا۔ اور لقمہ نے منہ تک پہنچنے سے انکار کر دیا اور کہا۔۔۔ازیں بوئے اسراف می آئید۔۔۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لنگر میں نمک ختم ہو گیا تھا اور بقال سے نمک اُدھار مانگ کر لایا گیا تھا۔

حضرت بابا فریدؒ گنجِ شکر نے نہ جانے کتنے روحانی تجربات ترکِ دنیا اور مراقبہ کے زاویہ سے کیئے۔ وہ اپنے پیرومُرشد کے بتائے ہوئے ایک خاص انداز اور زاویہ سے بیٹھ کر یادِ اللہ کرتے تھے۔ اپنے پیرومُرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے دنیا سے پردہ کر لینے کی خبر سن کر فوراً دہلی روانہ ہو گئے قاضی حمید الدین ناگوری نے انہیں خرقہ اور دیگر امانتیں دیں۔ وہ کچھ دن دہلی میں رہے مگر دہلی کی طرزِ حیات اور سازشی سیاست بھرے ماحول سے رنجیدہ ہو کر پھر ہانسی لوٹ آئے لیکن یہاں بھی انہیں سکون اور راحت نہیں ملی۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ اُن کا سارا وقت لے لیتی تھی۔

لہذا کسی اندرونی خواہش نے انہیں ہانسی چھوڑ کر کوئی خاموش ویران مقام

ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔

ایک دن حضرت بابا فرید الدین شکر گنج ؒ نے اپنی خانقاہ مریدوں کو دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بیس سال کے قیام کے بعد ہانسی چھوڑ دی۔

صاحبِ فضیلت بابا فریدِ گنج شکرؒ

ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر کے صوفی فقیروں اور درویشوں میں اعلیٰ و افضل شمار کئے جانے والے بابا فریدؒ روحانیت کی تاریخ میں زندہ و تابندہ بزرگِ معرفت ہوئے ہیں۔ ان کی ولدات ۱۱۷۵ء میں کھوتوال ضلع ملتان صوبہ پنجاب میں کھوتوال کے قاضی شیخ جمال الدین سلیمان کے یہاں والدہ قرسوم بی بی دختر نیک اختر شیخ وجیہہ الدین کی کوکھ سے ہوئی۔ آپ کے بڑے بھائی کا نام عز الدین محمد اور چھوٹے بھائی کا نام نجیب الدین محمد متوکل تھا۔ شیخ فرید کا خاندان امیر المومنین عمر فاروقؓ صاحب کے خاندانِ اعلیٰ وارفع سے تعلق رکھتا ہے۔ شاخ فرید کے بچپن کا زمانہ ملتان اور لاہور میں غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کے زوال اور غوری حکومت کے قیام یعنی ۱۱۸۰ء اور ۱۱۹۲ء کا درمیانی زمانہ تھا۔

شیخ فریدؒ کی والدہ قرسوم بی بی عرف مریم نیکی اور پاکیزگی کی مجسم تھی۔ رات رات بھر خدا کی عبادت میں محو رہتی تھیں۔ اسی نے ہی فریدؒ کو چھوٹی عمر میں عبادت کرنا اور نماز پڑھنا سکھا دیا نیز نیکی اور خدا پرستی کی جانب راغب کر دیا۔ فریدؒ کو ماں نے عبادت اور نیکی کی

راہ پر گامزن کیا تھا۔ لہٰذا انکا عقیدہ بن گیا تھا کہ ماں ہی اولاد کی بہترین رہنما ہے۔

فریدؒ کو پانچ چھ برس کی عمر میں ایک مسجد میں پڑھنے بھیجا گیا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فریدؒ نے قرآن شریف کی تلاوت بھی شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ خدا کی عبادت میں بھی مست رہنے لگا۔ انہی دنوں دلی سے اتفاقاً صوفی درویش جلال الدین زیدی کھوتوال تشریف لائے۔ فریدؒ کو دیکھتے ہی اُس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی فرمائی۔ کھوتوال کے مدرسے سے ابتدائی تعلیم پوری کر لینے کے بعد فریدؒ ۱۵ برس کی عمر میں ملتان چلا گیا اور منہاج الدین ترمذی کے مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے قرآن شریف پورا حفظ کر لیا اور چوبیس گھنٹے میں پورا قرآن کا وِرد کرنے لگا۔ اُنہی دنوں حضرت قطب الدین بختیار کا کی ملتان میں تشریف لائے اور حسنِ اتفاق سے اسی مسجد میں مقیم ہوئے جس میں فریدؒ پڑھا کرتا تھا۔ شرفِ نیاز حاصل ہوتے ہی فریدؒ ان کا مرید ہو گیا۔ ایک دن حضرت نے فریدؒ کو ایک کتاب پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ ''مولانا کیا پڑھ رہے ہو''۔ فریدؒ نے جواب دیا ''حضرت نافع پڑھ رہا ہوں۔ حضور کے کرم سے مجھے ضرور نفع ہو گا۔'' یہ کہہ کر فریدؒ نے اپنا سر مرشد کے قدموں پر رکھ دیا۔

حضرت بختیار کا کی نے خوش ہو کر اپنا دست رحمت فریدؒ کے سر پر رکھ دیا اور اپنے ساتھ دلی لے جا کر قاضی حمید الدین ناگوری و مولانا شمس الدین ترک جیسی معزز شخصیتوں کی موجودگی میں باقاعدہ بیعت فرمایا اور تکمیل تعلیم کے لئے واپس ملتان چلے جانے کی ہدایت فرمائی۔ خواجہ معین الدین چشتی جب اجمیر سے دلی تشریف لائے تو اپنے شاگرد سے بولے ''بختیار! تو نے ایسا شہباز پکڑا ہے جو ساتویں آسمان سے نیچے اپنا گھونسلا نہیں بنائے گا۔ فریدؒ ایسا چراغ ہے جو درویشوں کے سارے سلسلے کو روشن کرے گا''۔ خوش نصیبی کہنا چاہیئے کہ فریدؒ کو اپنے مرشد اور مرشد کے مرشدوں کی شفقت و رحمت حاصل رہی۔ مرشد کے حکم سے آپ ہانسی تشریف لے گئے۔ تقریباً ۱۹ سال ہانسی میں رہے۔ مرشد کی وفات کے بعد یہاں سے واپس اجودھن چلے گئے۔ سبھی سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ بابا فرید گرہست درویش تھے۔ اُن کی شادیاں ہوئیں، بیٹے بیٹیاں ہوئیں۔ اُن کی اولادیں ہوئیں۔ آپ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے نیاز رہے۔ کیچڑ میں کنول کی طرح رہے۔ اہل اقتدار اور

ان کی نوازشات سے بے نیاز رہے۔ آپ صاحب صبر و تحمل تھے۔ مخالفت اور سختی برداشت کرنے کا آپ میں زبردست مادہ تھا۔ اجودھن پہنچنے پر جب آپ کی روحانی شہرت بڑھنے لگی تو وہاں کے قاضی نے حسد کے مارے آپ کو اور آپ کے پریوار کو دِق کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آپ کے قتل کے لئے کرائے کا قاتل بھیجا جو شرمندہ ہو کر منہ چھپاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ بابا فرید دشمن سے بھی نفرت نہ کرنے اور ہمیشہ اُسے محبت سے رام کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ وہ خدمت خلق کو ہی اصل عبادت مانتے تھے۔ عاجزی اور انکساری ان کی شخصیت کے خاص اوصاف تھے۔

بابا فریدؒ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ایک سو ایک القاب مشہور تھے جن میں سے چند القاب یہ ہیں خواجہ فرید، بابا فریدؒ، مولانا فریدؒ، مسعود فریدؒ، متوکل فریدؒ، متقی فریدؒ، معظم فریدؒ، قطب المواحدین شیخ فریدؒ، شیخ فرید شکر گنج، جہاں گشت فریدؒ، صوفی فریدؒ، محقق فریدؒ، عبداللہ فریدؒ، حاجی الحاجات فریدؒ، وغیرہ۔

شیخ فرید عربی، فارسی، پنجابی اور ملتانی زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ اُن کے کلام کو پنجابی کی اولین تحریر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہندی، ملتانی یا جسے اب سرائیکی کہا جاتا ہے کہ وہ آدی کوی یعنی شاعرِ اوّل تھے۔ اُن کے کلام میں روحانیت، معرفت، وحدانیت اور تصوف جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ تمام زندگی کے نچوڑ کوزے میں دریا کی طرح سمو دیتے تھے۔ سستگی، سادگی اور صفائی کے سبب ان کا کلام سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے اور زبان زدعام ہو گیا ہے۔ ان کا کلام دوہروں یا شلوکوں کی صورت میں گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے اور سنت وانی اور گوربانی کے ساتھ بڑی شردھا اور عزت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ گورو گرنتھ صاحب میں شامل ان کے ۱۱۲ شلوک اور ۴ شبد ہی ان کا پنجابی یا ملتانی زبان میں ملنے والا مستند کلام ہے۔ فلسفیانہ مضامین کو نہایت سادہ لفاظ میں بیان کرنے پر اُن کو قدرت حاصل تھی۔ بابا فرید قرآن شریف اور دیگر عربی کتب کی جو عالمانہ تفسیریں پیش کرتے تھے وہ ان کے عالم فاضل ہونے کی مظہر ہوتی تھیں۔

آپ نے اجودھن میں جو جماعت خانہ قائم کیا تھا اُس میں آپ کے شاگردوں و مریدوں کی خاص تعداد تھی لیکن اس جماعت خانے کے گلدستے کے سب سے خوبصورت

پھول تھے حضرت نظام الدین۔ تقریباً ۲۰ سال کی عمر میں نظام الدین اجودھن پہنچے تھے۔
انہیں دیکھتے ہی بابا فرید نے فرمایا تھا۔

اے آتش فراقت دل را کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں را خراب کردہ

یعنی تیری جدائی کی آگ نے دل کو کباب کرڈالا ہےاور تیری ملاقات کی چاہ نے
جان کو تباہ کردیا ہے۔ اس پر نظام الدینؒ نے نہایت انکساری کے ساتھ جواب دیا تھا کہ
''میرے اندر بھی آپ کی قدمبوسی کی زبردست چاہ تھی جو مجھے آپ کے حضور میں کھینچ لائی
ہے''۔ بابا فریدؒ نے فرمایا تھا کہ اللہ کے فضل سے تو ایسا پیڑ بنے جس کی گھنی چھاؤں میں بے
شمار لوگوں کو سکون و راحت نصیب ہو''۔ بابا فریدؒ نے بڑی عمر والے مریدوں کے رہتے
۲۳ برس کی عمر والے نوجوان نظام الدین کو اپنی گدّی سونپ دی کیونکہ روحانیت عمر سے نہیں
مرشد کی مہر اور مرید کی رسائی پر منحصر ہوتی ہے۔ فرماتے تھے'' خلافت مانگنے سے نہیں دی
جاتی جو قابل ہوتا ہے اسے بنا مانگے مل جاتی ہے۔

''بڑھا ہوا شیخ فرید کمبن لگی دیہہ'' بابا فریدؒ بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ قویٰ
مضمحل ہو چکے تھے۔ آنتوں میں درد رہنے لگا تھا۔ آخر ۱۵/اکتوبر ۱۲۶۵ھ کو عشاء کی
نماز کے بعد بے ہوش ہو کر گر پڑے اور ہوش آنے پر 'یا حیُ یا قیوم' کہہ کر راہیِ ملک عدم
ہوئے۔ وفات سے قبل دلی سے آئے ہوئے محمد کرمانی کو اپنا اثاثہ (خرقہ، مصلاّ، عصا، پگڑی
یا امامہ اور کھڑاؤں) سونپ کر ہدایت کی کہ یہ تما اثاثہ شیخ نظام الدین اولیاء کو دے دینا۔ وہی
میرا گدّی نشیں ہوگا۔ حضرت نظام الدین ان کے روحانی وارث ہی نہیں داماد بھی تھے۔

بابا فریدؒ نے اپنے شلوکوں میں اللہ کو پیارا، کنت، سائیں، شوہ، سہاگ، مالک،
صاحب، سجن، دھنی وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ خطابات آتما کے پرماتما سے اور روح کے
خدا سے گہرے رشتے کے مظہر ہیں۔ خدا سے جدا ہوتی روح کو نہ اس جہان میں سکون
نصیب ہوتا ہے نہ اُس جہان میں۔ مالک کا قرب و وصال ہی سکون ابدی کا وسیلہ ہے۔
جنہوں نے اس مالک کو بھلا دیا ہے وہ دھرتی پر بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔

وسریا جن نام تے بھُئیں بھار تھیے

آپ فرماتے ہیں یہ تن فانی ہے۔ اِسے ایک دن خاک میں مل جانا ہے۔ قبر کے مکان میں سما جانا ہے۔

ایہہ تن ہوسی خاک نمانی گور گھرے

مالک کے رنگ میں رنگے ہوئے فقیر سخت ریاضت میں ہی اپنے من کا لہو سکھا دیتے ہیں۔ بابا فرید فرماتے ہیں:

فرید دلی رت نہ نکلے جے تن چیرے کوئی
جو تن رتے رب سیوں تن تن رت نہ ہوئی

شیخ فرید توکّل بخدا فقیر تھے۔ وہ اپنے مالک سے یہی دعا مانگتے تھے کہ مجھے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اگر کسی کے در پر ہاتھ پھیلانے کی نوبت آنی ہی ہو تو میرے جسم سے روح کو ہی نکال لینا۔

فریدا بار پرائے بیسنا سائیں مجھے نہ دیہی
جے تو ایویں رکھسی جویں سریر ہو لیہی

بابا فرید کا رہن سہن اور کھان پان نہایت سادہ تھا۔ روکھی سوکھی جوار کی روٹی کھا کر شربت کا گلاس نوش فرمالیا کرتے تھے۔ عمر کے آخری ایام اجودھن میں انتہائی مفلسی کے عالم میں گزارے۔ آخری وقت تکفین کے لئے بھی گھر میں پیسہ نہیں تھا۔ امیر خورد کی دادی نے کفن کے طور پر سفید چادر عطا کی اور گھر کا دروازہ گرا کر اُس کی اینٹوں سے مقبرہ تعمیر کرا گیا۔ پاکپٹن میں بابا فریدؒ کا جسدِ خاکی گھر کے آنگن میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔ عقیدت مندوں نے پکا مزار بنوایا جس کی مرمت بعد میں فیروز شاہ تغلق نے کرائی۔ بابا کا یہ مزار آج عقیدت مندوں کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔

مکان جائداد، حسن جوانی، دولت طاقت سب کچھ فانی۔ لیکن کم عقل انسان ان پر اِبھیمانی۔ محل چھوٹ جاتے ہیں جسم کو جا کر رہنا پڑتا ہے قبر کے مکان میں۔ محلوں میں پھولوں کی سیج پر سونے والے جسم قبر میں اینٹ کا تکیہ بنائے پڑے رہتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے جسم کا مانس نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں۔ جسم کی بے حسی و بے جانی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ کروٹ بدلنے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔

فریدا اِٹ سرہانے بھئں سونوں کیڑا لڑیو ماس
کیڑیا جُگ واپرے اِکتو پیا پاس

جو آنکھیں کاجل کا بھار بھی نہیں سہتی تھیں وہ مرنے کے بعد بے رونق کھو کھلے گڈھے بن کر رہ جاتی ہیں اور اُن میں پنچھی گھونسلے بنا کر رہنے لگتے ہیں اور بچّے دینے لگتے ہیں۔

کجّل دیکھ نہ سہندیاں سے پنکھی سوئی بیھٹو

جوانی میں نوجوان چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے بڑے بڑے سفر طے کرلیتا ہے، ناچتا کودتا ہوا بن پربتوں کو پار کرجاتا ہے پر بڑھاپا آنے پر جسم اتنا لاغر اور ناتواں ہوجاتا ہے کہ کھاٹ کے پاس پڑا کوزہ بھی سوکوس دور پڑا معلوم ہوتا ہے

فریدا اِنی نِکی جنگھیئے تھل ڈونگر بھویوی
اجو خیردے کو جڑا سے کوہاں تھیومی

بڑھاپا آنے پر قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں۔ ہوش حواس تاب وتواں سب جاچکتے ہیں۔ کمزور جسم آخر خود بھی بے جان ہوجاتا ہے۔

چبنڑ، چلنڑ، رتنڑ سے سُنیر بہہ گئے
ہیڑے مُتی دھاہ سے جانی چلے گئے

دانت، ٹانگیں، آنکھیں اور کان کام کرنا بند کردیتے ہیں۔ باقی اعضاء بھی ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ کمزور و ناتواں جسم دھائیں مار کر روتا ہے کہ میرے سب ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا اب ہم بھی جانے والے ہیں احباب تو گئے۔

فریدا در درویشی گاکھڑی چلاں دُنیا بھتی
بنہہ اٹھائی پوٹلی رکھے ونجاں گھتی

خدا کی درگاہ کا سچا درویش ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے دنیاداری کی گھڑی اٹھا رکھی ہے۔ اسے کہاں جا کر پٹکوں؟ سچا درویش بننے کے لیے دنیادری کا چھوڑنا لازمی ہے۔

کجھو نہ بُجھے، کجھو نہ سُجھے دنیا گجھی بھاہی
سائیں میرے چنگا کیتا نہیں تاں ہاں بھی دجھاں آہی

دنیوی اعمال اور عیش و عشرت کے سامان جو ظاہر طور پر سکھ کے سادھن لگتے ہیں حقیقت میں آتش پنہاں ہیں اور تباہی کا کارن ہیں۔ میرے مالک نے کرم فرما کر مجھے بچالیا نہیں تو میں بھی اس میں جل بجھا ہوتا۔

فریدا جے توں عقل لطیف کالے لِکھ نہ لیکھ
آپنڑے گریبان مہی سر نیواں کری دیکھ

اے فرید اگر تو عقلمند ہے تو کالے کارنامے کر کر کے اعمال نامے کو سیاہ نہ کر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ کہ تو کتنا گنہگار ہے۔

فریدا جے تیں مارنی مکیاں تنہاں نہ مارے گھُم
آپنڑے گھر جایئے پیر تنہای دے چُم

درویش کو خطا بخش ہونا چاہئے اُس میں برداشت کا مادّہ ہونا چاہیے۔ فرید کہتے ہیں جو لوگ تجھے بُرا بھلا کہیں، مارنے پیٹنے لگیں تو جواب میں تو انہیں مرانے پیٹنے نہ لگ بلکہ فراخدلی سے معاف کردے اور ان کو چھوڑ کر اُن کے قدموں کو چُوم لے۔ تجھے اپنے اصل گھر لوٹ جانا ہے سب سے خلوص و محبت سے پیش آ۔

ڈیکھ فریدا جو تھیا داڑھی ہوئی بھُور
اگہو نیڑا آیا پچھا رہیا دور

اے فرید دیکھ بچپن جوانی اور موج مستی کا زمانہ پیچھے چھوٹ گیا۔ داڑھی سفید ہوگئی۔ عاقبت کی فکر کرنے کا وقت آگیا۔ اب سنبھل اور عاقبت سنوار لے۔

ڈیکھ فریدا جی تھیا سکّر ہوئی وِس
سائیں باجھہو آپنے ویدن کہیے کِیش

اے فرید دیکھ کیا سے کیا ہوگیا۔ جو عیش و عشرت شکّر جیسے چھبنے لگتے تھے انجام کار زہر ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے میں مالک کے سوائے کس کے آگے فریاد کی جائے۔ کون ہے جو درد بھری داستان سُنے۔

فریدا خاک نہ نیندیئے خاک جیڈ نہ کوئی
جیوندیاں پیراں تلے مویاں اوپر ہوئی

فریدا لوڑے کی بجوڑیا کِکری بیجے جٹ
ہنڈھے اون کتائیدا پیدھا لوڑے پٹ

سنت کبیر کے لفظوں میں ''بوئے پیڑ ببول کا کھانا چاہے آم'' فرید کہتے ہیں کسان چاہتا تو ہے انگور کھانا لیکن بور رہا ہے ببول، کات تو رہا ہے اون اور پہننا چاہتا ہے ریشم۔ عمل بُرے ہیں پھل اچھا چاہتا ہے۔

فریدا میں بھولا وا پگ دا متو میلی ہوئی جائے
گہلا روح نہ جانئی سر بھی مٹی کھائے

غافل انسان سر پر بجی پگڑی کی فکر کرتا رہتا ہے کہ کہیں میلی نہ ہو جائے وہ یہ نہیں جانتا کہ جس سر پر پگڑی سجار ہے ہے وہی سر ہی ایک دن مٹی میں مل جانا ہے۔

فریدا سکر کھنڈ، نبات، گُڑ، ماکھیو، مانجھا دُدھ
سبھے وستو میٹھیاں رب نہ بجشی تدھ

فرید کہتے ہیں شکر، چینی، مشری، گُڑ، شہد اور بھینس کا دودھ یہ سب چیزیں میٹھی ہیں لیکن اے میرے رب! یہ تیری مٹھاس کے سامنے ہیچ ہیں۔

ظاہر ہے کہ بابا فریدُ کا کلام اُن کی شخصیت کی طرح سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ اُن کا کلام زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اُنکا نصیحت آموز کلام عوام کو غفلت اور لاعلمی کے اندھیروں سے نکال کر زندگی کی حقیقت کی آگاہی کی روشنی عطا کرتا ہے۔ خوبصورت مثالوں، تشبیہوں اور استعاروں نے اُن کے کلام کو پُر تاثیر بنادیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں معرفت کے رموز سمجھاتے، دنیا اور زندگی کی اصلیت سے آگاہ کرتے ہوئے بغض، نفرت، کینہ وعناد سے دور رہ کر خلوص، محبت، رواداری اور بھائی چارے کی زندگی جینے کی تلقین فرمائی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے بابا فریدِ پنجابی اور ملتانی کے ''آدی کوی'' ہیں۔ وہ اوّلین صوفی شاعر ہیں۔ اُنکا کلام بلاغت نظام فنّی اور معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اُس کی عظمت کو الفاظ میں بیان کرسکنا مجھ ناچیز کے بولنے کی بات نہیں ہے۔ البتہ یہ میری کمال خوش نصیبی ہے کہ میرے وجود کا خمیر بھی اُسی مٹی سے اٹھا ہے جس نے اس عظیم صوفی سنت کو جنم دیا ہے اور مجھے بھی اپنے بزرگوں سے رجحانِ معرفت ورثے میں ملا ہے۔ میرے نانا بزرگوار چودھری روشن لال ایم اے جوڈپٹی کمشنر

کے موقر عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد سنیاسی ہو گئے تھے۔ مولانا روم اور گیتا کے رمز شناسوں میں سے تھے۔ اب آخر میں میں ملتانی یا سرائیکی میں لکھی گئی وہ نظم پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو بابا فرید سے متعلق ملتان (پاکستان) میں اپریل ۲۰۰۳ء میں تین روزہ فرید سیمینار میں پیش کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ اتفاقاً وہ سیمینار ملتوی ہو گیا اور یہ نظم ابھی تک بابا فرید کی نذر نہیں کی جا سکی۔

مُلتانی زبان دے ''آدی کوی'' شیخ فریدؒ گنجِ شکر دی نذر

میں کراں جے تیڈیاں تعریفاں   میں کیڑھے کھیت دی مُولی ہاں
تیڈیاں پروازاں ہن اُچیاں   میں حالی پولٹن سِکھدا پیاں
تو چترکار ہئیں فطرت دا   تُو دریا پریت محبت دا
تُو رمزشناس حقیقت دا   نئیں ثانی تیڈی عظمت دا
شاعر ہئیں مِٹھڑی بولی دا   پنجابی اتے سرئیکی دا
شاعر عرفان دی دھرتی دا   اعلےٰ جذبات روحانی دا
ہے شاعری عالی شان تیڈی   ہے صاف سلیس زبان تیڈی
شیرینی ہے پہچان تیڈی   موسیقی جند تے جان تیڈی
تو ورڈزورتھ ملتانی دا   تو غالب، میر سرئیکی دا
حقدار ہئیں مسند عالی دا   ہم رُتبہ حافظ، سعدی دا
قائل ہین لوگ فقیری دے   قائل ہن تیڈی پیری دے
تیڈے غم دی عالمگیری دے   روحانی ملک دی میری دے
ہے بے شک نام غلام تیڈا   شامل نہ مگر مقام تیڈا
وحدت دی مے دا جام تیڈا   درویشانہ پیغام تیڈا

رنا تے اے احسان تھیوے
شکل شہوندی آسان تھیوے
ہُوندا سجدہ پروان تھیوے
جگ تے ہُوندا کلیان تھیوے

بابا فریدؒ کا مسلک اور تعلیمات

بابا فریدؒ شکر گنج جو عام طور پر پر حضرت بابا فریدؒ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے اہم ستون ہیں۔ آپ کے تصوف کی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اخلاقیات، خدمتِ خلق، بھائی چارہ، ایثار کا درس دیا۔ ہندوستان میں اگر دیکھا جائے تو تصوف نے ہی اسلام کو پھیلایا ہے۔ صوفی ازم دراصل اسلام کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھنے اور اس کے معنی تلاش کرے معرفت کی معراج کو پہنچنا ہے۔ صوفی ازم نے اپنی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا ہے۔ صوفیاء اکرام نے کبھی بھی بادشاہوں کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ یہ اُن کی تعلیمات ہی تھیں کہ اگر جنگل میں بھی جا کر بیٹھ جاتے تھے تو لوگ جوق در جوق اُن کی باتیں سننے کے لئے اکٹھا ہو جاتے تھے۔ آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے دراصل اسلام صوفیوں اور اُنکی تعلیمات کے ذریعے پھیلا ہے۔ تلوار کے زور پر آپ حکومتیں قائم کر سکتے ہیں لیکن دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ بابا فرید بھی ایک ایسے ہی صوفی تھے جنہوں نے اخوت و محبت، ایثار و بھائی چارہ کا درس دیا۔ چشتیہ خاندان کے بزرگوں میں سب سے بڑے بزرگ خواجہ

حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کے جانشین اور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے جانشین اور خلیفہ بابا فریدؒ شکر گنجؒ تصوف کے تمام خانوادوں میں سب سے زیادہ مقبول یہی سلسلۂ چشتیہ ہے اور اس کی شاخیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو حضرت بابا فریدؒ کی ذات بابرکات روحانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ اور آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کا سب سے اہم مرکز رہی ہے۔ جس کے فیوض و برکات آج ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے دور دراز گوشوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ حضرت بابا فرید آج سے کوئی تقریباً ۸۳۲ سال پہلے پیدا ہوئے تھے لیکن آج بھی آپ کی تعلیمات اور آپ کی روحانیت کا نور اور سرور سارے عالم ہی میں پھیلا ہوا ہے۔ حضرت بابا فرید شکر گنج اس لحاظ سے بھی قسمت کے بڑے دھنی تھے کہ انہیں اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ قطب صاحب اور دادا پیر حضور خواجہ غریب نواز اجمیری سے بیک وقت فیض حاصل ہوا۔ صوفیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ روایت ہے کہ خواجہ غریب نواز نے اپنے مرید و جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمایا کہ " آؤ فرید الدین کی کچھ نعمت عطا کریں اس کے بعد یہ بزرگ بابا صاحب کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے اور توجہ دی۔ شاید یہ اسی دو آتشہ نعمت ہی کا کرشمہ تھا کہ حضرت خواجہ غریب نواز اور حضرت خواجہ قطب صاحب کے بے شمار فیض یافتگان میں جو مرتبہ اور مقام بابا صاحب کو حاصل ہے اور ان کے مبارک دم قدم سے تصوف اسلام کی جس قدر اشاعت ہوئی اس کی نظیر دکھائی نہیں دیتی۔ چشتی طریقۂ تعلیم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں معلم یا رشد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ شاگرد یا مرید کے لئے پیر ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ پیر و مرشد ہی مرید کے لئے عملی امتحانات کی اقسام اور ان کی مدت مقرر کرتا تھا اور وہی حقیقی معنوں میں تعلیم کا کام انجام دیتا تھا۔ یہاں اس واقعہ کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جب بابا فرید نے خواجہ قطب الدین کی خدمت میں عرض کیا کہ حکم ہو تو چلّہ کروں یہ بات خواجہ قطب الدین کے مزاج کے موافق نہ تھی ارشاد ہوا کہ ضرورت نہیں ان چیزوں سے شہرت ہوتی ہے یعنی مرشد اگر تعلیم دے رہا ہے اور وہ کسی طریقے کو ناپسند کرتا ہے تو مرید کی اتنی مجال نہیں کہ وہ پیر و مرشد کے خلاف جائے۔ اسی کے بعد خواجہ قطب الدین نے بابا فرید کو چلّہ معکوس کرنے کو کہا تھا لیکن

بابا مرید نہیں جانتے تھے کہ چلہ معکوس کیا ہوتا ہے اور پیرومرشد کی ہیبت کی وجہ سے ان سے پوچھ نہ سکے تو شیخ بدرالدین غزنوی سے پوچھا کہ یہ چلہ معکوس کیا ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ چالیس دن یا چالیس رات اپنے پاؤں کو رسّی میں باندھ لو اور کسی کنویں میں اُلٹے لٹک کر خدائے تعالیٰ کی عبادت کریں۔ یہ چلہ معکوس ہے جو بابا فرید نے کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پیر اپنے مرید کو بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیا کرتے تھے اور عوام کی خدمت کے لئے مرید کو پوری طرح تیار کرتے تھے یہ مرید رات دن خدا کے بندوں کی خدمت کرتے تھے جب بھی لوگ ان کے کسی عمل یا فعل سے ناخوش ہوتے تو فوراً منھ پر بیان کردیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھے شخص نے ان سے کہا کہ شیخ فرید تم ملنے والوں سے کچھ بیزار لگتے ہو خدا کا شکر ادا کرنے کا بہتر طریقہ اختیار کرو۔ شیخ فرید نے خاموشی سے سر جھکالیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ بابا فریدؒ کی کشف وکرامات کے لاکھوں قصّے عوام النساس کی زبان پر ہیں اور ان سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ 'فوائد الفواد' میں حضرت نظام الدین کا ملفوظ مبارک ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ بابا فریدؒ نے انہیں دشمنوں کے خوش رکھنے اور حقداروں کا حق ادا کر کے راضی کرنے پر زور دیا جب حضرت نظام الدین اجودھن سے واپس آئے تو سب سے پہلے ایک پارچہ فروش کا قرضہ جو ان پر واجب تھا وہ ادا کیا اور ایک کتاب جو کسی سے مستعار لی تھی وہ گم ہوگئی تھی بابا فریدؒ کی کرامات سے دونوں کام ہوئے یعنی قرضہ بھی ادا ہوگیا اور گم کردہ کتاب کی قیمت بھی ادا کی۔

خیر المجالس میں حضرت منیرالدین چراغ ؒ نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ دو بھائی تھے ایک نے دنیا کو ترک کر کے درویشی کو اپنالیا دوسرے بھائی نے اس کی بیوی بچوں کی کفالت کا بیڑہ اٹھایا۔ اچانک دوسرا بھائی بیمار ہوگیا تو درویش بھائی جو بابا فریدؒ کی خانقاہ میں رہ کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا اُس نے شیخ فریدؒ سے کہا کہ 'آپ جانتے ہیں کہ میرا بھائی سارے گھر بار کو چلاتا ہے وہ اب اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اگر وہ مر گیا تو شاید میں اتنی دل جمعی سے عبادت نہ کرسکوں گا'۔ بابا صاحب نے کہا جاؤ تمہارے بھائی صحت یاب ہو چکا ہے، اور حقیقتاً جب وہ شخص واپس آیا تو بھائی ٹھیک تھا یہ حضرت بابا فریدؒ کی زبان مبارک کی تاثیر تھی۔ ایک حدیث بھی ہے کہ بندہ عبادت کے ذریعہ میرا قرب تلاش کرتا ہے

تو میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے سنتا ہے، میں اُس کی زبان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے بولتا ہے۔ اسی مضمون وحدیث کو مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں یوں بیان کیا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

یعنی خاصانِ خدا کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ خدا ہی کے الفاظ ہوتے ہیں بندے کی صرف زبان ہوتی ہے بابا فریدؒ نے ایک دن فرمایا تھا:

''چالیس سال تک بندۂ مسعود نے وہی کیا جو خدا چاہتا تھا اب خدا وہ کرتا ہے جو مسعود چاہتا ہے''

بابا فرید کی شخصیت اور تعلیمات کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کی اہمیت اور معنویت کل اتنی نہیں تھی جتنی آج ہے ایک اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ پنجابی زبان کے سب سے قدیم شاعر ہیں اور ان کا عارفانہ کلام اس زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہے جسے بقول خواجہ نثار احمد فاروقی ''پنجابی زبان و ادب کی تاریخ میں وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی زبان میں چاسر Chanser اور فارسی میں رودکی کے کلام کی ہے۔ دوسرے حضرت بابا فرید کے یہ عارفانہ اشعار اور اشلوک گوروارجن دیو نے سکھوں کی مقدس کتاب و آدی گرنتھ صاحب میں محفوظ کر دیئے ہیں اور آج دنیا بھر میں لاکھوں سکھ ان اشعار کو اسی عقیدت اور محبت سے پڑھتے ہیں جس طرح وہ سکھ دھرم کے بانی گورونانک کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں۔''

بقول پروفیسر گوربچن سنگھ طالب

''حضرت بابا فریدؒ کا پنجابی کلام آدی گرنتھ صاحب میں درج ہے جس کے مطالعے سے ان کی جدّتِ طبع اور قدرتِ ادرات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انسانی روح کے تجربات اور عمیق احساسات سے وہ بہت حد تک متاثر ہوئے ہیں انہیں اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ انسان کی عمرِ بے بہا کا بہت سا حصہ مال و دولت کے حصول اور دنیوی کاروبار میں رائیگاں جاتا ہے۔ موت سر پہ منڈلاتی رہتی ہے لیکن انسان غفلت میں وقت ضائع

کرتا ہے۔

باباصاحب انسان کو تحمل، بردباری، جبر و مکر وریا توکّل، علم و انکساری کی تعلیم وتلقین کرتے ہیں وہ بار بار انسان کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ وہ مکر وریا سے بچے کسی کے دل کو ایذا نہ پہنچائے ان کا عقیدہ ہے کہ دل بدست آور کہ حج اکبر است'

باباصاحب کی تعلیمات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بھلائی کرنے کے بہانہ ڈھونڈتے رہا کرو۔ بھلائی کرنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سب اپنی فکروں اور پریشانیوں میں اور خواہشوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یہاں باباصاحب کی چند ملفوظات کا ذکر کرنا ضروری سمجھوں گی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ نے شیخ فرید کے ملفوظات میں پانچ سو باتیں جمع کی ہیں اور آج کے دور میں جن کی سخت ضرورت ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے بن کر رہو کہ سب لیتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جب وہ دیتا ہے تو کوئی چھین نہیں سکتا۔

۲۔ نادان کو زندہ نہ سمجھو۔ سمجھدار نظر آنے والے ناسمجھ سے بچو۔

۳۔ ایسا سچ بھی نہ بولو جو جھوٹ معلوم ہو۔

۴۔ ماہ اور سال کے لئے غم نہ کھاؤ۔ موت کو کسی جگہ بھی نہ بھولو۔

۵۔ ہر شخص کی روٹی نہ کھاؤ۔ لیکن روٹی دو ہر ایک کو۔

۶۔ دل کو شیطان کا کھیل نہ بناؤ۔

۷۔ اپنے باطن کو ظاہر سے اچھا رکھو۔ احسان مانو مگر کسی پر احسان جتاؤ نہیں۔

۸۔ جس چیز کی برائی کی دل گواہی دے اسے فوراً چھوڑ دو۔

۹۔ کسی دشمن سے چاہے وہ کام سے خوش ہو بے کھٹکے نہ ملو۔

۱۰۔ طاقت پر بھروسہ نہ کرو۔ عدل و انصاف کرنے میں عزت وحشمت سمجھو وغیرہ وغیرہ

حضرت شیخ بابا فریدؒ کے بعض ملفوظات کے بارے میں حضرت نظام الدینؒ نے لکھا ہے کہ بابا فریدؒ نے فرمایا: چار باتیں دنیا بھر کے سات سو درویشوں سے پوچھی گئیں

سب نے ایک ہی جواب دیا۔

سب سے زیادہ عقلمند کون ہے؟	جو دنیا تیاگ دے
سب سے زیادہ دوراندیش کون ہے؟	جو گھڑی گھڑی بدلتا نہیں
سب سے زیادہ غنی کون ہے؟	قناعت کرنے والا
سب سے زیادہ فقیر کون ہے؟	قناعت کو چھوڑنے والا

اور فرمایا، اللہ کو اپنے بندے سے شرم آتی ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اللہ اسے نامراد لوٹا دے۔

اور فرمایا: اگر ہے تو غم نہیں، اگر نہیں تو غم نہیں اور کہا کہ نامرادی کا دن مردانِ خدا کی شب معراج ہوتی ہے۔ اور فرمایا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ میں نے دس سال تک صوفیوں کی شاگردی کی تب یہ معلوم ہوا کہ 'وقت' کیا ہے۔ باباصاحب فرماتے تھے کہ صوفی وہ ہے جس سے ہر شے صاف ہو جاتی ہے اور وہ کسی چیز سے مکدر نہیں ہوتا۔ قرض لینے کو بابا فرید سختی سے منع کرتے تھے۔ فرماتے تھے جو شخص اِس فقیر کا مرید ہو اس کو قرض نہ لینا چاہئے۔ بابا فرید علم حاصل کرنے پر بھی بہت زور دیتے تھے کہتے تھے اگر علم محض چاہے سے مل جاتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا۔ پس کوشش کرو اور کاہل نہ بنو۔ اور غفلت نہ برتو کیونکہ سستی کرنے والے کو آخرت کی ندامت ملتی ہے۔ بابا فرید فرماتے تھے کہ جسم کو من مانی نہ کرنے دو کہ بہت مانگے گا یعنی دوسرے معنی میں باباصاحب تقویٰ اور نفس کو مارنے کی تلقین کرتے تھے۔ بابا فرید خود ایک درویش منش تھے اس لئے بار ہا کہتے تھے کہ جو درویش خوش حالی کا طلب گار ہو اسے لالچی سمجھو۔ فرمایا اپنے عیبوں کو دیکھو اور دشمن کی کڑوی بات سے پھر نہ جاؤ، بلکہ دشمن کے آگے سپر بھی نہ ڈالو اور اگر ساری مخلوق کو اپنا دشمن بنانا چاہتے ہو تو مغرور بن جاؤ۔ فرماتے تھے کہ کوشش کرو کہ مر کر زندہ ہو جاؤ۔

باباصاحب نے ۱۲۶۸ء میں انتقال فرمایا۔ اس وقت سے اب تک یہ ملک کتنے ہی سیاسی انقلابات سے گزرا ہے کتنے بڑے بڑے بادشاہ آئے اور چلے گئے کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں کتنی تہذیبیں اُبھریں اور ڈوب گئیں۔ مگر ان سب حوادث اور تغیرات کے باوجود بابا فرید کا آستانہ اسی طرح عوام الناس کی عقیدت اور محبت کا مرکز اور ان کی روحانی

پیاس بجھانے والا سرچشمہ بنا رہا ہے۔ امیر تیمور جیسا سفاک جنگجو بھی جس نے اپنی راہ میں آنے والے ہر شہر کو آگ اور خون سے نہلا دیا وہ بھی جب اجودھن پہنچا تو اس نے اپنی خوں آشام تلوار نیام میں رکھ لی تھی اور اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بابا فرید کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید کے نام ہی کی برکت تھی جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے آپ کی ڈاڑھی کا ایک بال لے رکھا تھا اور جب کوئی مریض آتا حضرت نظام الدین اُس بال کا استعمال کرتے۔ حضرت نظام الدین فرماتے تھے کہ اگر کسی مریض کی قسمت میں شفا نہ ہوئی تو لاکھ تلاش کرنے پر بھی وہ بال نہیں ملتا تھا۔

ہر دور میں بابا فرید کے عقیدت مندوں نے بابا سے اپنی عقیدت اور گہری محبت کو زندہ رکھا ہے اس کا اندازہ ان رسموں سے ہوتا ہے جو آج بھی چشتی سلسلہ میں جاری ہے۔ شمالی ہندوستان میں آج بھی دلہن کے سازوسامان میں ''بافرید کا سہاگ پُڑا'' شامل ہوتا ہے اور میں آپ کو بتادوں کہ خود میری شادی پر بھی اس طرح کا سہاگ پُڑا اسسرول سے آیا تھا۔ زچہ کو دردِ زہ سے نجات دینے کے لئے آج بھی کوری ٹھیکری پر بابا فرید کا ٹونا لکھ کر پیٹ پر رکھا جاتا ہے۔ راستے کے امن اور چوروں سے محفوظ رہنے کے لئے آج بھی یہ شعر تعویذ پر بھی لکھا جاتا ہے۔

الٰہی بحقِ شکر گنج شاہ
نگہدار مارا ز دزدانِ راہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بابا صاحب کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے فریدالدین بابا اے میرے گنج شکر
عالم الحاد تیرے خوف سے زیر و زبر
تو نے بخشا ایک جہاں کو بادۂ عرفاں کا نور
زہد کا اخلاص کا تسلیم کا ایماں کا نور
راہِ حق سے اور حق سے تھی شناسائی تیری
اس لئے ہوتی ہے ہر دل میں پذیرائی تیری

ٹوٹ سکتا ہے نظامِ انجم و شمس و قمر
اور مٹ سکتے ہیں دنیا سے یہ دشت و بحر و بر
لیکن اے گنج شکر تو زندہ و پائندہ ہے
کل بھی تابندہ رہے گا آج بھی تابندہ ہے

بابا فریدؒ

میرا بھارت رشیوں منیوں، فقیروں، سنتوں، پیروں اور پیغمبروں کا دیش ہے یہ وہ دھرتی ہے جہاں ان لوگوں نے اپنے اعمال، عبادت اور تعلیم سے بھولے بھٹکے لوگوں کو راہ دکھائی۔ ان میں سے بابا فریدؔ جنہیں فرید شکر گنج حضرت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا جنم ضلع ملتان (پاکستان) کی بستی کھوتوال میں ۱۱۷۳ء میں ہوا۔ ان کی والدہ خدا پرست نیک عورت تھیں۔ انہوں نے ہی ان کو نیکی کا راستہ دکھایا۔ والد بزرگوار شیخ جلال الدین انہیں بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئے۔ والدہ ہمیشہ ہی کہتی رہتی تھیں کہ خدا ہر عبادت گذار کو شکر دیتا ہے اور جب وہ عبادت کرتا تو وہ اس کی چٹائی کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتی جسے وہ کھا کر خوش ہو جاتا۔ والدہ نے انہیں جنگل میں عبادت کے لئے بھیج دیا جس پر شیخ فرید نے ۳۶ سال تک تپ کیا۔ سردی، برسات، دھوپ، بھوک، پیاس سب کچھ برداشت کیا۔ اس دوران وہ صرف تین بار اپنی والدہ محترمہ سے ملنے آئے۔ تیسری بار جب ملنے کے لئے آئے تو راستے میں ایک درخت کے نیچے سو گئے لیکن چڑیوں کے شور سے تنگ آ کر اوپر کی طرف چڑیوں کو دیکھا اور غصہ میں چڑیوں کو کہا ''مرو''۔ اس کے ''مرو'' کہتے ہی چڑیاں بیہوش ہو کر نیچے گر پڑیں ایسا لگتا تھا کہ وہ مر گئی ہیں۔ فرید حیران ہو گیا کہ یہ کیا میرے ''مرو''

کہنے سے مری ہیں یا اپنی آئی موت سے مری ہیں؟ یہ سوچتے ہوئے وہ زور سے چلّایا۔ ''اُڑ جاؤ'' اور چڑیاں پھر سے اُڑ گئیں۔ جس پر اسے تکبر ہو گیا اور وہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی وہ دو میل ہی آگے گیا ہو گا کہ اسے پیاس لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک عورت کنوئیں پر پانی بھرتے ہوئے اسے زمین پر ڈال رہی ہے تو فریدؒ وہاں پہنچے اور پانی مانگا۔ لیکن اس عورت نے اُن کی کوئی پروانہ کی اور اپنے کام میں لگی رہی۔ فریدؒ نے دوبارہ پانی مانگا اور غصہ دکھایا تو وہ بولی غصہ تھوک دو بابا فریدؒ۔ میں کوئی درخت کی چڑیا نہیں جو تیرے غصہ سے مرجاؤں گی۔ یہ کہتے ہوئے وہ حسب سابق پانی نکال نکال کر انڈیلنے لگی۔ فرید سوچنے لگے کہ چڑیوں کو مرتے، پھر سے اڑتے کسی نے نہیں دیکھا تو اسے کیسے پتہ چلا؟ یہ پانی پلانے کی بجائے اسے نیچے انڈیل رہی ہے۔۔۔! اُس عورت نے آواز دی۔ حضور پانی پی لیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھ آئی عورت سے کہا کہ بیچارے نے ماں کے کہنے پر عبادت تو شروع کر دی لیکن ''گورو بن گت ناہیں'' نہیں سمجھا۔ ابھی تک اسے گورو نہیں ملا اس لئے کورے کا کورا ہی ہے۔ فرید کو اس کی یہ بات پسند آئی تو اس سے پانی کو بار بار زمین پر انڈیلنے کا سبب پوچھا۔ تو وہ بولی۔ بابا پیاس بجھانے سے آگ بجھانا ضروری ہے۔ زیادہ پوچھنا چاہتے ہو تو میری بہن کے پاس جاؤ وہ آپ کو بتائے گی۔ وہ آپ کو فلاں جگہ ملے گی اس کا پتہ بتا کر وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔

شیخ فرید اس پتہ پر پہنچے۔ رات بھر ست سنگ۔ مناظرے کا لطف اٹھایا اسے پتہ چلا کہ اس گھر میں آگ لگی تھی اور کنوئیں سے پانی ڈالنے سے وہ آگ بجھی تھی۔ اور خواجہ قطب الدین بختیار کا پتہ بھی انہیں وہاں سے ملا۔ اور ساتھ ہی مشورہ دیا گیا کہ وہ انکا بیعت قبول کریں۔ سچے دل سے تلاش کرو گے تو وہ مل ہی جائیں گے۔ بابا نانک نے بھی کہا ہے کہ ''جن کھوجیا تن پایا''۔ سچی لگن کے ساتھ بابا فرید کامل فقیر کے جھونپڑے تک پہنچ ہی گئے۔ وہاں وہ خواجہ کے نورانی پُر جلال چہرے کا دیدار کر خوش ہو گئے اور پیاسی آنکھوں کی پیاس بجھ گئی۔ وہ ان کے مرید ہو گئے۔ اور دن رات ان کی خدمت میں لگ گئے۔ صبح سویرے دریا سے پانی لے آتے، گرم کرتے انہیں نہلاتے، یہ ان کا روز کا معمول ہو گیا۔ پرانے زمانے میں لوگ آگ جلانے کے لئے انگارے راکھ میں دبا کر رکھ لیتے تھے تاکہ ان سے آگ جلا لی جائے۔ مُرشد نے اپنے مُرید کا امتحان لینے کے لئے ایک دن اس آگ پر

پانی ڈال دیا۔ آدھی رات کو جب وہ جاگا تو دیکھا کہ آگ بجھی ہوئی ہے مُرشد کو تکلیف ہوگی اسی وقت اٹھا۔ پانی بھرلایا اور آگ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دور ایک چوبارے میں روشنی دیکھی تو آواز دی۔ وہ ایک ویشیا کا گھر تھا۔ آواز سن کر اس نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ وہ بولا۔ مجھے انگارہ چاہئے۔ تو وہ بولی یہاں انگارے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ تو وہ بولا مجھے انگارہ دے دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لو۔ وہ بولی اس کی قیمت آنکھ ہے اس نے آنکھ دی انگارہ لے لیا۔ اور اس آنکھ پر پٹی باندھ چل دیا۔ قدرت خدا کی زور سے بارش آگئی۔ اس نے راکھ میں انگارہ چھپا کے رکھ لیا۔ اور سوچنے لگا:

فریدا گلی اے چکڑ دوری۔ دھری نال پیار نہو،
چلاں تے بھجے کملی۔ روکاں تے ٹٹے نہو۔
بھجو کجو کملی اللہ برسے لہو،
جائی ملاں تناں سجناں تو تاں ہی نہو۔

اور وہ بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کمبل سنبھالتا ہوا مرشد کے گھر آ ہی پہنچا اور پانی گرم کرنے لگا۔ مرشد غیبی نگاہ سب کچھ دیکھ چکے تھے وہ بولے فریدؔ آج مجھے اپنے ہاتھوں سے نہلاؤ۔ نہاتے ہوئے پوچھنے لگے کہ یہ تیری آنکھ کو کیا ہوا ہے؟ پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟ فریدؔ بولے ''حضور آنکھ چلی گئی''۔ وہ بولے گئی نہیں آ گئی ہے۔ پٹی کھولو۔ فریدؔ نے پٹی کھولی۔ آنکھ صحیح سلامت تھی۔ فریدؔ فوراً ان کے قدموں پر گر پڑا۔ اور مرشد کامل نے اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور روحانی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اور اسے اپنا جانشین بنا دیا۔ فرمایا:

ڈِکھ فریدا جے تھیا سکّر ہوئی وِس
سائیں باجھوں اپنڑے ویدن کہئے کس

دنیا کے عیش و آرام ظاہری طور پر شکر کی طرح میٹھے لگتے ہیں لیکن ان کا انجام زہر کی طرح ہوتا ہے۔ جسے بعد میں انسان سمجھ لیتا ہے اور پوچھتا ہے:

کندھی اتے رکھڑا کچرک بنھے دھیر
کچے بھانڈے رکھئے فریدا کچر تائیں نیر

یہ زندگی دریا کے کنارے کھڑے درخت کی طرح ہے یعنی کچے گھڑے کی طرح

ہے یہ سانس کی طرح ہے جس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مرشد کامل نے بابا فریدؒ کو گدی دی۔ روشنی دی۔ دولت دی اور بابا فریدؒ ۱۲۶۵ء میں اپنے مرشدِ کامل سے جا ملے۔ اور اپنی گدی مرید امیر خسروؒ کو سونپ دی اور رب حقیقی سے جا ملے۔ یہ پیر فقیر دنیا سے نرالے ہوتے ہیں ان کے قول فعل نصیحت ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ان سے کچھ سبق لیں۔ عمل کریں اور فیضیاب ہوں۔

باباؔ فریدؒ کی سماجی خدمات

بزرگانِ دین اور صوفیائے اکرام کی تعلیمات میں ایسے سماج کا تصور مجود ہے۔ جس میں نہ صرف انسان دوستی، محبت واخلاص، اُخوت ومساوات عدل وانصاف ہی نہیں ملتا بلکہ مظلوم کی بے غرض خدمت وحمایت کا درس بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں سماج کا وہ تصور ہے جس میں نفرت وتعصب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان بزرگانِ دین نے محبت اوراخلاص کی جو شمع فروزاں کی اس نے معاشرے کے سبھی پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ علم وادب بھی اُن سے اچھوتا نہ رہ سکا۔

زمانہ بدل گیا، سلطنتیں مٹ گئیں، بادشاہتیں ختم ہوگئیں، لیکن اُن بے تاج شہنشاہوں کی حکومتیں آج بھی ہمارے دل ودماغ پر قائم ہیں۔ کیونکہ یہ روحانی بادشاہ جن کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے، وہ وقت اور زمانے سے بالاتر ہوتے ہیں، اور اُن کے نام رہتی دنیا تک قائم رہتے ہیں۔ ایسے ہی روحانی بزرگوں میں ایک نمایاں نام بابا شیخ فریدؒ گنج شکر کا ہے۔

صوفی ازم کی تحریک ہندوستان میں حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے ذریعہ پہنچی اور عام ہوتی چلی گئی۔ ان سے پہلے صوفیوں میں حضرت شیخ علی بن

عثمان، علی الجھوری تھے۔ جو داتا گنج بخش کہلائے۔ اُن سے معاشرے کو جو روحانی فیض پہنچا اس کا اثر آج بھی باقی ہے۔ لیکن افسوس کہ اُن سے کوئی سلسلہ وابسطہ نہیں۔ بعد ازاں حضرت خواجہ معین الدین سے حضرت قطب الاقطاب، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فیض اٹھایا۔ اُن کا مزارِ مبارک قطب صاحب میں ہے۔ حضرت بابا فرید اُن کے بڑے خلیفہ ہی نہیں بلکہ چشتی سلسلہ کے نہایت اہم بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کے بعد یہ سلسلہ شاخ در شاخ آگے بڑھتا ہوا شمال اور جنوب میں پھیلتا گیا۔ جن میں حضرت بابا فریدؒ گنج شکر کی حیثیت مرکزی ہے۔ آپ نے اپنے مرشد کے علاوہ دوسرے روحانی بزرگوں سے بھی فیض اٹھایا اور ان مقدس خوشبوؤں کو اپنی ذاتِ بابرکات میں جمع کرتے ہوئے چاروں طرف دور دور تک پھیلایا۔ کیونکہ

خوشبو کو پھیلنے کا بڑا شوق ہے مگر
ممکن نہیں ہواؤں سے رشتہ کئے بغیر

اس تعلق سے ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں تصوف کو جو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں یہاں کے مختلف مذاہب اور روحانی روائتوں کا ایک طویل سلسلہ ریشم کے تاروں کی طرح ملتا چلا گیا۔

قاضی جاوید کے خیال میں:

''ایک لحاظ میں وہ تصوف کی اس صورت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جس ہندی مسلم تصوف کا نام دیا جا سکتا ہے'' (ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے اکرام کا حصہ)

بابا فرید کی ولادت کا دور تاریخ میں انتہائی پر آشوب اور یورش کا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منگولوں کے خونخوار حملوں سے وسط ایشیاء کی وادیاں کراہ رہی تھیں۔ اور بے گناہ انسانوں کا لہو چیخ رہا تھا۔ بے شمار حکمراں خاندان تباہ ہو گئے تھے۔ بابا فرید کے بزرگ بھی اس افراتفری کے زمانے میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ شہاب الدین غوری کے عہد میں بابا فریدؒ کے دادا قاضی شعیب کابُل سے لاہور تشریف لائے اور وہاں سے قصور منتقل ہو گئے، بعد میں سلطان نے انہیں کھتوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے ایک آپ کے والد جمال الدین تھے۔ جمال الدین سلیمان کے

گھر ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء کو ماہ رمضان میں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کے متعلق یہ رایت عام ہے۔ کہ اُس بچے نے عالم شیر خوارگی میں بھی مقدس ماہِ رمضان کا احترام کیا۔

بہرکیف اس نومولود اور مبارک فرشتے کا نام فریدالدین مسعود رکھا گیا۔ اس گھرانے میں پہلے ہی سے صاحبانِ تقوا موجود تھے۔ گھر والوں نے فریدالدین عطار کے نام پر (جن کا زمانہ ۱۱۱۹ء کے قریب تھا جو فلسفۂ تصوف پر متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔) اُن کا نام فرید رکھا۔ فرید عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی یکتا، بے مثال اور لاثانی کے ہیں۔ اُس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ شیر خوار بچہ اپنے نام کے مطابق ایک دن ایک بلند پایہ درویش بن کر شیخ فرید کے نام سے مشہور ہوگا۔

آگے چل کر آپ کے نام کے ساتھ شکر گنج، گنج شکر کے القاب کا بھی اضافہ کیا جانے لگا۔ گنج شکر کی وجہ تسمیہ عام روایت کے مطابق یہ تھی کہ بچے کو خدا رسیدہ بنانے کے لئے اُنکی والدہ نے ایک نفسیاتی راستہ اختیار کیا، چونکہ اُن کو شکر بہت پسند تھی۔ اس لئے اُن کی والدہ شکر کی ایک چھوٹی سی پڑیا جائے نماز کے نیچے چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ پڑیا انہیں انعام کے طور پر غیب سے ملی ہے۔ ایک بار اُن کی والدہ مقررہ جگہ پر شکر کی پڑیا رکھنا بھول گئیں۔ لیکن یہ ان کی خدا پرستی اور ان کے حال پر خدا کی مہربانی کا کرشمہ تھا کہ نماز کے بعد مقررہ جگہ پر انہیں شکر کی پڑیا مل گئی۔ اس واقعہ کو کرامت سے تعبیر کرتے ہوئے فرید کو گنج شکر کہا جانے لگا۔

ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ جوانی میں شیخ فریدؒ جب انتہائی شدید ریاضت کے دور سے گزر رہے تھے۔ تو انہوں نے تین دن کا روزہ رکھا، روزہ افطار کرنے کے لئے جب کچھ میسر نہ آیا تو غشی کی حالت میں چند سنگریزے انہوں نے منہ میں ڈال لئے۔ کرشمہ دیکھیئے وہ خدا کے حکم سے شکر کی ڈلیاں بن گئے۔

لیکن گنج شکر کی اصل وجہ تسمیہ شیخ فرید کے مُرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے اس قول کو سمجھنا چاہئے جو انہوں نے اُن کے مزاج کی شیرینی کو دیکھ کر کہا تھا کہ تم شکر کی طرح میٹھے ہوگے۔

آپ کے نام کا ایک ضروری جز مسعود بھی ہے۔ یعنی صاحب سعادت اور اس

میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک گنجِ شکر کے مقدس لقب سے مشہور انام ہیں۔ یعنی آپ کے پاس جو خزانہ ہے وہ شکر ہے۔ اور شکر زندگی کا وہ لطیف اور شیریں عنصر ہے جو روحانی تعلق، عشق حقیقی اور پیار کی صورت میں دوسروں تک پہنچا۔

بابا فریدؒ کی زندگی ہی میں انہیں ایک سو ایک ناموں سے یاد کیا جانے لگا تھا۔ اور اُن میں سے ہر نام اُن کے کردار کی کسی نہ کسی خصوصیت کی نشان دہی کرتا تھا۔ مستقبل کے اس دُرویش کے بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور پرورش کے فرائض والدہ قُرسوم بی بی نے انجام دیئے۔ یہ وہ بچہ تھا کہ جس نے صرف ۱۱ سال کی عمر میں قران پاک حفظ کر لیا تھا۔ (بابا شیخ فرید، گربچن سنگھ طالب)

اسی زمانے میں آپ کی ذات اور نیکی کا چرچہ پورے شہر میں پھیل گیا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملتان تشریف لے گئے۔ اُس زمانے میں ملتان تصوف کا ہی نہیں ہند ایرانی یا ہند اسلامی تہذیب کا بھی ایک بڑا اور اہم مرکز تھا۔ جہاں بڑے بڑے علماء اور دانشور موجود تھے۔ اور ہر طرف طلباء کے لئے درس گاہیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ملتان کی زبان کا قدیم نمونہ جسے ہم ''سرائیکی'' کے نام سے جانتے ہیں وہ یقیناً اردو زبان سے بہت قریب ہے۔

ملتان میں آپ نے مولانا منہاج الدین کے پاس قیام کیا۔ اُن سے کتاب ''نافع'' پڑھی اور نافع کے مطالعے کے دوران ہی آپ کی ملاقات حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی۔ اُن کو دیکھتے ہیں بابا فرید کے اندر ایک غیر معمولی کشش جاگ اٹھی۔ آپ نے خواجہ بختیار کاکیؒ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور التجا کی کہ وہ انہیں اپنا مرید کر لیں۔ اور درخواست کی کہ انہیں اپنے ساتھ دلی لے چلیں۔ روحانیت کی طرف اس رجوع واشتیاق نے خواجہ بختیار کاکی کے دل پر بہت اثر کیا۔ اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ انہیں اپنا مرید ضرور بنائیں گے۔ لیکن فی الحال فرید کو اپنی تعلیم جاری رکھنی چاہئے۔

ملتان میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد بابا فرید اعلیٰ تعلیم کے لئے قندھار گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایران، عراق، خراسان کا دور دور تک دورہ کیا۔ اور مکہ معظمہ بھی تشریف

لے گئے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسافرت صوفی طرز زندگی کا اہم پہلو ہے۔ بابا صاحب اپنے دور کی مروجہ علوم، شرع، فقہ اور فلسفۂ تصوف میں بھی نمایاں دست گاہ حاصل کی۔ ان کی اس علمیت اور فضیلت کی بنا پر انہیں شیخ الاسلام اور شیخ کبیر کہا جاتا ہے۔ جعفر قاسمی کے مطابق:

''یہ بات یقینی ہے کہ شیخ فرید ظاہری و باطنی علوم اسلامی کے عقلی ورثے کے پوری طرح مالک تھے۔ کیونکہ انہوں نے علم دین کی مکمل اور معیاری تعلیم حاصل کی تھی۔'' (ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے اکرام کا حصہ۔ روبینہ ترین)

آپ کی شاعری میں زہدوتقویٰ کے علاوہ معصیت کی دل فریبی اور موت کے خوف وزیاں کے شدید احساس کے ساتھ انسانیت پسندی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ عوام کے لئے سیدھی سادھی زبان میں اُن کا پیغام تھا کہ سچ سب چیزوں سے افضل ہے۔ اور اگر سچ پر کسی دوسری شے کی افضلیت ہے تو وہ ہے اخلاق۔

لیکن آج کے دور میں جب تخریب، نفرت، قتل وغارت گری کا دور دورہ ہے۔ اُن کی تعلیم اور دکھائے ہوئے راستے پر چلنا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ لیکن

کون جوڑے گا ٹوٹی ہوئی کرچیاں
بستی میں تو اک شیشہ گر بھی نہیں

ہم اُن کی یہ بات بھول گئے کہ خدا کی قربت اُس کے بندوں کی خدمت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے کہنے کے مطابق انسان کا دل ایک ایسا قیمتی ہیرا ہے، جسے لاپروائی سے نہیں پیار ومحبت سے چھونا چاہئے۔ شیریں کلامی خوبیوں کی کنجی ہے۔ کیونکہ وہ خود ایک معلمِ اخلاق تھے۔ اور انہوں نے اپنے ہی لوگوں کی زبان میں شاعری کی تھی، اُس زبان میں جو اُس دور میں مروج تھی۔ اور عوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ ان کی شاعری نے عوام کے دلوں کو تسکین بخشی اور اُن کے سینوں میں روحانیت کے چراغ روشن کئے۔ اور اپنے میٹھے بولوں سے وہ شکر بکھیر دی جس کی شیرینی نسل درنسل چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے۔ اور یہی صفت ان کی عظمت میں چار چاند لگاتی ہے۔

اہلِ پنجاب کے دلوں میں بابا فرید گنج شکرؒ کے لئے ایک مخصوص جگہ ہے۔ کیونکہ

وہ پنجابی زبان کے اولین شاعر ہیں جن کا مثبت کلام صدیوں کا فاصلہ طے کر کے ہم تک پہنچا ہے۔

حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق نے بابا فرید کو اردو کا اور مسعود حسین شہاب نے پنجابی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔(اپنجاب میں اردو)

یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو تمام پنجابی زبان بولنے والوں کا خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہو ان کا کوئی بھی مسلک ہو انہیں بابا فریدؒ کی محبت کے رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔ بابا فریدؒ برِصغیر کے وہ پہلے صوفی ہیں، جن کی شہرت برِصغیر، ہندو پاک سے باہر بھی پہنچی جس کے لئے قاضی جاوید اپنی کتاب ''فلسطین کے مسلم اولیا اور عبادت گاہیں'' میں رقم طراز ہیں:

''فلسطین میں ایک ایسا زاویہ ہے۔ جس کا نام بابا فریدالدین کے نام پر ہے۔''

ہندوستان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس ملک میں بہت سے ایسے درویش پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کے باہمی رشتوں میں رس گھولنے اور ان کی مذہبی تعلیمات کو اپنے اپنے طریقوں سے عام کرنے کی کوشش کی۔ جن میں بابا شیخ فرید گنج شکرؒ ایک ایسی منفرد شخصیت ہیں۔ جن کا سکھ بھی احترام کرتے ہیں۔ اور یہی ایک سماجی سچائی ہے۔ جو حضرت کی ذاتِ والا کو منفرد بنا دیتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ گورونانک جو شیخ فرید کی وفات کے تین سو (۳۰۰) سال بعد دنیا میں آئے تھے، وہ بھی شیخ فرید کا کلام سن کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ دنیا کے یہ واحد مسلم صوفی بزرگ ہیں جن کا کلام مقدس گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔

ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ہم یہاں انہیں خراج عقیدت پیش کرنے اکٹھے ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انتہائی نفس کشی اور نہایت سادگی کی زندگی بسر کرنے والا ایک چھوٹی سی بوسیدہ سی کملی رکھنے والا (کہ جب سر پر ڈالی تو پیر کھل جائیں اور جب پیروں پر ڈالیں تو سر کھل جائے۔) وہ بابا صوفی بزرگ شیخ فرید گنجِ شکر اپنے پیچھے ایک ایسا درس چھوڑ جائیں گے جو آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ایک چراغ کی طرح آنے والی نسلوں کے لئے روشنی اور رہنمائی کا سبب بنا رہے گا۔

ان کی سادگی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں وہ افطار صرف ایک چھوٹی سی شربت کی پیالی سے کرتے تھے۔اب یہ الگ بات ہے کہ آج افطار کے نام پر ہم کیا کیا اہتمام کرتے ہیں اور اس پُرکاری کے مقابلے میں اُس سادگی کو نظر انداز کردیتے ہیں۔

اس صوفی بزرگ کی زندگی حقیقت میں عفو اور درگزر کا آئینہ تھی۔جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار ایک ساحر نے اپنے جادو کے زور سے شیخ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔طویل مدت تک بیمار رہنے اور دعاؤں، دواؤں کے بے اثر ثابت ہونے کے بعد پتا چلا کہ اس ساحر نے شیخ کا پتلا بنا کر اور اُس میں سوئیاں گاڑ کر اسے زمین میں دفن کردیا۔جب وہ پتلا زمین کھود کر باہر نکلا گیا اور سوئیاں بھی الگ کی گئیں۔تو شیخ صحت یاب ہوگئے۔اجودھن کے مقامی حکمراں نے اس ساحر کو قتل کرنے کی پیشکش کی لیکن آپ نے اسے معاف کردیا اور اس کی جان بخشی کرائی۔

اپنے اس برتاؤ سے انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ جان لینا اور دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔انسان وہی ہے جو دوسروں کے گناہوں کو معاف کردے یہ تعلیم ہمیں دوسرے پیغمبروں اور صوفیوں سنتوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔شیخ خدا کی یاد میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ اپنے گھر والوں کا بھی شاذ ہی خیال آتا تھا۔ایک بار اُن کی بیوی روتی ہوئی حاضر ہوئی اور کہا" کہ بچہ بھوک سے مرگیا ہے۔" بابا نے اپنے ذہنی سکون کو برقرار رکھا اور کہا کہ خدا کا بندہ مسعود خدا کے حکم کو کیوں کر ٹال سکتا ہے۔بچہ مرگیا ہے تو اُسے دفنادو۔

اسی طرح ایک بار ایک عورت گھبرائی ہوئی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ کوئی یوگی اپنی ساحرانہ قوت سے اس سے دودھ وصول کرتا ہے (وہ دودھ بیچنے کا کام کرتی تھی) جس سے اُس کا نقصان ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ شیخ نے عورت پر رحم کھا کر یوگی کے جادو کے اثر کو زائل کردیا۔

درویشانہ ریاضتوں اور روحانیت کی منزل اعلیٰ تک پہنچنے کے اور کرامات کے مظاہروں سے حضرت کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور یوں بھی یہ سب نمود و نمائش کے لئے

نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خرق عادت کی مثالیں اور نمونے حضرت کی زندگی میں زیادہ نہیں ملتے بلکہ انسانی اخلاق اور روحانیت کی اعلیٰ قدروں کا احترام نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اور یہی ایک صوفی کی زندگی کا مقصد بھی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تصوف کا رشتہ تمام عالمِ انسانی اور مذہب وملت، طبقہ ونسل سے دوستی کا ہوتا ہے، غیریت کا نہیں۔ تصوف روحانی تعلیمات اور اعلیٰ درجہ کے انسانی اخلاق کے لئے ذہنوں اور زندگیوں کو تیار کرتا ہے۔ محنت ومشقت، ایثار، قربانی اور عبادت و ریاضت کا مقصد بھی انسانی خوشیوں، خواہشوں، تمناؤں اور مادی تقاضوں کو ایک ایسی راہ پر لاتا ہے۔ جو انسانی خلوص اور خدمت کا ایک نمونہ بن جائے۔

''عشق نہ جانے جات کجات''

بابا گورونانک دیو کی پہلی پوڑی بھی تو یہی ہے کہ ہم سب ایک نور سے پیدا ہوئے ہیں اور سب ایک ہی رب کے بندے ہیں۔ اب اچھے اور برے کا فرق کیا معنی رکھتا ہے۔

''کون بھلے کون مندے۔''

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں نسلوں کا اختلاف ہی نہیں رنگوں کا اختلاف بھی ہے، زبانوں کا اختلاف ہے، ذات پات کا اختلاف ہے۔ ان سب کو ایک لڑی میں پرونا، سچائی کے راستے پر لانا بہت بڑا انسانی، مذہبی اور سماجی فریضہ ہے۔ اور یہ فرض ہمارے درویشوں، فقیروں اور اللہ والوں نے اپنی شاعری اپنی تعلیمات اور اپنی ذات کے ذریعہ بہت اچھے اور اونچے درجہ کی مثالیں پیش کر کے انجام دئے ہیں۔ یہ تصوف کی تحریک بھی ہے اور بھگتی آندولن بھی۔

صوفی ازم ایک طور سے اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ مذہبی فلسفہ ہے فقر ودرویش کی روایت ہے۔ اس کو ہم کتابوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ شعروسخن میں بھی مل جائے گا۔ بزرگانِ دین کی یادگاروں میں بھی ہم اس کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح آئینہ، روشن اور شفاف شیشہ دراصل حضرت بابا فریدؒ جیسے صوفیوں کی ذات میں ملتا ہے۔ جو اپنے طور پر سچائی اور اچھائی کے تصور کو ایک پاکیزہ تصویر کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اور ایک کے بعد دوسرا

صوفی سلسلہ اس روشنی کی لڑی کو اس ستاروں کی کہکشاں کو آگے بڑھا دیتا ہے۔

اس سے بڑی دین اور کیا ہو سکتی ہے کہ دلوں کو جوڑا جائے، امیر حسن سنجری نے ''فوائد الواد'' میں لکھا ہے۔

''ایک بار بابا کو کسی نے قینچی نذر کی۔ بابا نے جواب دیا۔ مجھے سوئی دیجئے۔ کیونکہ میں سیتا ہوں کاٹتا نہیں۔'' (فوائد الفواد، امیر حسن)

وہ لوگوں کو ایک دوسرے کے عقائد کے طریقوں سے قریب لانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپس میں پھوٹ پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بابا فرید کو شریعت سے جو گہری عقیدت تھی وہ طریقت کی بنیاد تھی۔ انہوں نے زندگی بھر محبت کا راستہ اختیار کیا۔ اور ہمیشہ یہی چاہا کہ انسانی دکھوں کو کم کیا جائے۔ امیری غریبی کے فرق کو مٹایا جائے۔ زبانوں اور بولیوں کی اس طرح خدمت کی جائے کہ دور تک اور دیر تک یہ پھول کھلے رہیں۔ اور ان کی خوشبوئیں سمٹتی اور بکھرتی رہیں۔

سمٹتی اس لئے کہ نئے نئے مرکز قائم ہوں اور بکھرتی اس لئے کہ نت نئے سرحدوں کو عبور کریں۔ اور وقت کی قید و بند سے آزاد ادھر سے اُدھر تک پھیل جائیں۔

صوفیوں، فقیروں اور سنتوں کی بات تو آج بھی ہوتی ہے، لیکن آج ہم اپنے اردگرد ذات پات بولی اور معشیت کی روز بروز اونچی ہوتی ہوئی دیواریں دیکھتے ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ انسانیت آج کہاں باقی رہ گئی ہے۔

یقیناً اس صورتِ حال کو بدلنے میں بابا فرید کے پیغام (جو کہ انسان کو انسان کے ساتھ جوڑنے کے لئے ایک پُل کا کام کرتا ہے۔) اور جذبہ، زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ آج بابا فریدؒ کے اس شلوک کو پڑھنے اور سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔

فریدا بُرے دا بھلا کر غصہ من نہ ہنڈھائے
دہی روگ نہ لگئی پلے سبھ کچھ پائے

''یعنی اے انسان۔ تو ہمیشہ بُرے آدمی کا بھی بھلا کیا کر۔ دل میں غصے کو نہ آنے دے۔ بدلے کی خواہش ترک کردے۔ اس طرح تو کسی مرض میں مبتلا نہ ہوگا اور اپنے مقصد و مدعا کو بھی پائے گا۔'' (کلامِ حقانی، ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل)

اُن کی تعلیم نہ صرف ذاتِ لاتعداد کی سچی اور صادق حمد و ثنا ہے بلکہ اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ انسان کی زندگی مختصر ہے اور اس چھوٹی سی زندگی میں اُسے اندھیرے سے اُجالے کی سمت ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اور نفرت، ظلم و جبر کی اس دنیا کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنی ہے جہاں محبت اور صرف محبت ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا فرید گنج شکرؒ آج بھی روشنی کا ایسا مینار ہیں جس سے روشنی حاصل کر کے یکجہتی، رواداری، انسانی اُخوت، احترامِ آدمیت، محبت اور میل ملاپ کی شاہراہ کو تلاش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انسانی رشتوں کی عظمت ہی وہ بنیاد ہے۔ جس سے ایک خوبصورت سماج تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح قرونِ وسطیٰ میں بھی بابا فریدؒ کے کلام میں وہ جز صاف نمایاں ہیں جو جدیدیت کے نمائندہ جز ترکیبی کہلاتے ہیں۔ اُن کے کلام کا یہ پہلو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ بابا فریدؒ کی تعلیات کو ہر اُس جگہ پہنچایا جائے جہاں انسانی آبادیاں ہیں کیونکہ بابا فریدؒ کی شخصیت ہندوستان کی اُس گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے جس پر ملک کی بنیاد رکھی ہوئی ہے اگر یہ بنیاد کمزور ہوگی تو ملک کمزور ہوگا اور اگر اس بنیاد کو طاقت ملے گی تو ملک کی قومی ایکتا اور آپسی بھائی چارے کو فروغ ملے گا۔ بابا فریدؒ کی سماج کو یہی سب سے بڑی دین ہے۔ جس پر چل کر ہم ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں اور بابا فریدؒ کی راہوں کو منور کر سکتے ہیں۔

میں اپنی بات اس دعا کے ساتھ ختم کرتی ہوں۔

''مجھے اس فقیر کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے۔''